IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LAHORE

Book No. 16-0 8

Auth. No. ح - مکتبہ

Acc. No. 191

B5/- Item No 42
(1) 92/1
13 AUG 1971

جوہر

شمارۂ خصوصی بیادگار
علامہ اقبال رحمۃ اللہ

IQBAL ACADEMY, KARACHI. LIBRARY
191
Book No. [redacted]
28 NOV 1968

مدیر
محمد حسنین سید متعلم بی اے

مہتمم
طفیل احمد قاسمی متعلم بی اے

مجلسِ شوریٰ
بدر الحسن بی اے (جامعہ) برکت علی فراقؔ بی اے (جامعہ)
محمد عرفان انصاری بی اے (جامعہ)

ناشر
مکتبہ جامعہ
دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی
ردوم ۱۲۵۰

بار اول	نومبر ۱۹۳۸ء	ایکہزار
بار دوم	مارچ ۱۹۴۰ء	۱۲۵۰

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

۲۱۵

ج۔ ق۔ ش

891.66

ع وھ۔ س

891.6605

ع وھ۔ س

فہرست مضامین

۱۔ پیامات	....	۵
۲۔ تعارف	مدیر	۱۷
۳۔ اقبال کے پیام کا متن اور شرح	علامہ سید سلیمان ندوی	۱۹
۴۔ مختصر حیات اقبال	محمد حسنین سید متعلم بی اے	۲۲
۵۔ عقل و عشق اقبال کی شاعری میں	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی	۳۶
۶۔ اقبال	پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی	۴۶
۷۔ ڈاکٹر اقبال	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)	۵۶
۸۔ حیات اقبال کا سبق	مولینا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی	۶۴
۹۔ اقبال، شخصیت اور پیام	پروفیسر محمد سرور صاحب	۷۲
۱۰۔ مقام عقل و عشق	پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب	۱۲۰
۱۱۔ اقبال کا فلسفہ زندگی و عمل	ڈاکٹر عبد الحمید صاحب زبیری ایم اے، پی ایچ ڈی	۱۳۱
۱۲۔ اقبال کی تعلیم	محمد عرفان خاں صاحب ندوی متعلم بی اے (جامعہ)	۱۴۱

۱۳- مثنوی اسرار خودی	مولینا محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۱۵۶
۱۴- اقبال اور انسانیت	حسن سبحانی صاحب متعلم بی اے	۱۷۶
۱۵- خودی اور اقبال	بشیر احمد صاحب انصاری، بی، اے	۲۰۵
۱۶- پس چہ باید کرد	پروفیسر سید نواب علی صاحب	۲۱۳
۱۷- اقبال کا جذبۂ مذہبیت	مولینا سید احمد صاحب اکبر آبادی	۲۲۶
۱۸- خضر راہ	محمد اسماعیل خانصاحب متعلم بی، اے	۲۳۶
۱۹- اسلامی تمدن کی رُوح	حافظ ضمیر الدین صاحب بی اے	۲۴۴
۲۰- مومن کی بانگِ اذان	محمد عبد الملک صاحب متعلم بی اے	۲۵۴
۲۱- ساقی نامہ	مسعود حسین خانصاحب متعلم بی اے	۲۶۷
۲۲- اقبال کے سو شعر	محمد طیب صاحب فاروقی بی اے (جامعہ)	۲۷۴

پیامات

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

صدر انجمن اتحاد

عزیزم سلمہ اللہ، خوش رہیے اور تندرست

مجھے بہت افسوس ہے کہ بیماری نے اس کا موقع نہ دیا کہ "جوہر" کے اقبال نمبر کے لئے کوئی مضمون لکھتا۔ آپ کہتے ہیں کوئی پیام ہی دے دو، تو میں کیا پیام دوں۔ آپ جس شخص کی یاد میں یہ پرچہ نکال رہے ہیں اس کا کلام ایسا جامع پیام ہے کہ اگر ہمارے نوجوان اسے سمجھ لیں اور اس پر کاربند ہوں تو شاید ہماری ملت کے دن پھر جائیں۔ افسوس کہ ابھی اس کے سمجھنے والے کمیاب اور اس پر عمل کرنے والے یوں سمجھئے کہ نایاب ہیں۔ لیکن پیام کا آنا بتاتا ہے کہ شاید سمجھنے والے بھی پیدا ہونے والے ہیں! خود اقبال کا ظہور ہماری ملی زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ڈھارس بندھتی ہے کہ اب رُت بدلنے کو ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے خزاں دیدہ چمن میں اقبال آنے والے "قافلہ بہار" کا "طائر پیش رس" تھا جس کی صدا سے اس "خاک ہزار سالہ" میں زندگی کی ایک رمق سی محسوس ہونے لگی۔ جس نے اپنے نفس گرم سے اس کے دل گرفتہ غنچوں کی گرہ کشائی کی اور جس کے نغمۂ دل نواز نے اس چمن کے مردہ دلوں کو سوز آرزو سے پھر ایک بار آشنا کر دیا، ان کے سواد دیدہ میں ایک نئی نظر اور ان

کے خمیر میں ایک نئے جہان کی طرح ڈال دی۔

اس لئے کہ اقبال ان شاعروں میں نہ تھے جو زندگی سے بس لطف اٹھاتے ہیں اور اس کا گیت گاتے ہیں۔ وہ ان مسیحا نفسوں میں سے تھے جن کے دم سے زندگی کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ جو لوگ ان کے یہاں فارسی "آب و رنگ شاعری" ڈھونڈتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال اس مرتبہ پر راضی نہ تھے۔ وہ تو ہمیں شکوہ خسروی بخشنے کی فکر میں ہیں اور "تاج کسریٰ" کو ہمارے قدموں میں لا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے لفظوں کی رواتی بھی دل کو اپنے ساتھ بہائے جاتی ہے، مگر ان کے کلام سے فکر و خیال اور یقین و ایمان کے چشمے بھی ابلتے ہیں۔ ان کے بول میٹھے ہیں اور کیسے میٹھے، پر تول میں بھی یہ بڑے ہی وزنی ہیں۔ ان کے لفظ حسین ہیں اور دلنشیں اور ان کا خیال عمیق ہے اور دلکشا۔ ان کے کلام کے زربفت میں لفظوں کی شوکت اور ان کی گھلاوٹ، ان کے رقص اور ان کے ترنم کا تانا ہے تو بانے کے لئے شاعر نے اپنی فلسفیانہ فکر کے دربے بہا کو قلب مومن کی دہکتی آگ میں تپا تپا کر وہ تار تیار کئے ہیں جو رگ جاں کی طرح زندہ ہیں اور جن کے نور حیات اور قوت حیات بخش کو زمانہ کا ہاتھ کبھی ماند نہ کر سکے گا۔

اقبال کو جب پڑھئے تو ان دونوں چیزوں کا خیال رکھئے۔ اس کے لفظوں سے بھی ضرور لطف اٹھائیے۔ مگر یہ نہ ہو کہ اس کے "عشق بے پروا" اور فکر "فلک پیما" سے اپنے لئے "ندرت فکر و عمل" کا سامان فراہم نہ کریں۔ اقبال کے کلام سے فکر و عمل کی بے شمار راہیں آپ پر کھلیں گی اور جب ان راہوں میں سے آپ کسی پر مجاہدانہ چلیں گے تو ان کے الفاظ کی موسیقی آپ کا ساتھ دے گی۔ اور آپ کے قدموں کو آگے بڑھائے گی۔ آپ کمزور ہیں تو اقبال آپ کو توانائی

بخشے گا۔ ہر بے معنی بہیمی توانائی نہیں، بوہ اس توانائی کو بامقصد اور بامعنی بنانے میں بھی آپ کی مدد کرے گا۔

آپ اپنے وجود کے آئین مضمر سے بے خبر "نفس غیر" کے سہارے موت کی سی زندگی کاٹ رہے ہیں اور ہر مجبور غلام کی طرح آقا کے گوشۂ چشم کا ہر اشارہ آپ کو کبھی ادھر لے جاتا ہے کبھی اُدھر، اقبال آپ کو آپ کی زندگی واپس دلائے گا، آپ کو اپنی تمام صلاحیتوں کے ہم آہنگ نشو ونما کی راہ دکھائے گا۔ اور "یکسوئی و آزادی" کی دولت سے مالامال کر دے گا۔

اگر آپ اپنی شخصیت کے نشو ونما کا مطلب غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ آدمی گستاخ ہو جائے اور بے ادب اور بدتمیز، اگر خودی کو آپ نے خودغرضی اور نفس پرستی کے مرادف جان لیا ہے تو وہ آپ کو ادب، اطاعت اور ضبط نفس کی منزلوں سے گزر کر تربیت خودی کے صحیح راستہ پر ڈالے گا۔

آپ "خودی" کو انفرادیت سمجھتے ہوں تو بتائے گا کہ خود "خودی" کی نشو ونما کے لئے "بیخودی" درکار ہے۔ وہ بتائے گا کہ افراد کی کامل نشو ونما جماعت ہی میں ممکن ہے اور حیاتِ اجتماعی کے مقاصد و معیار کا تعین خالی عقل و منطق سے ممکن نہیں، وجدان و الہام، اور یقین و ایمان اس کے سوتے ہیں۔ عقل یہاں کام آتی ہے۔ مگر "ادب خوردہ دل" ہونے کے بعد ان مقاصد و اقدار ازلی و ابدی کا حامل بنا خودی کی کامل نشو ونما کی شرط ہے۔ انہی اقدار ازلی پر مستحکم ایمان و یقین کو اور ان کے حصول کے ذوق فطری اور جذب مستقل کو اقبال عشق سے تعبیر کرتا ہے۔ اس سے مقاصد حیات کا تعین ہوتا ہے اور یہی ان کے حصول کی قوت بخشتا ہے "عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات"۔

اقبال کے کلام کا مطالعہ اگر توجہ اور خلوص سے کیجئے گا تو

اس سے روشنی بھی ملے گی جو منزل کی سیدھی راہ دکھائے گی اور حرارت بھی ملے گی جو دل کو گرمائے گی۔ اور قدم کو تیزی اور استقامت بخشے گی۔ اس کے کلام کو پڑھئے، پرکھئے، سمجھئے، اپنے اوپر طاری کیجئے، یوں شاید کہ خود را بازآفرینی۔

خاکسار حسین طیب

حضرت مولینا ابوالکلام آزاد

ملک میں اس وقت ہزاروں نوجوان تحصیل علم میں مشغول ہیں۔ ان ہزاروں افراد میں جامعہ ملیہ کے طلبا کی تعداد معدودے چند افراد سے زیادہ نہیں، لیکن یہی چند افراد اگر چاہیں تو اپنے امتیازی وصفوں سے جامعہ کو وقت کی سب سے بہتر اسلامی درس گاہ کا درجہ دے سکتے ہیں۔

جامعہ کے طلبار کے لئے یہ امتیازی اوصاف کیا ہو سکتے ہیں؟ یقیناً اُن تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں جو ملک کی تمام درس گاہوں میں ہر مستعد طالب علم حاصل کر سکتا ہے۔ وہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے جو صرف جامعہ کے کارخانے ہی میں ڈھل سکتی ہے۔

جامعہ کو جن لوگوں نے قائم کیا تھا انھوں نے سمجھا تھا کہ موجودہ زمانے کی بہترین تعلیمی خصوصیات کے ساتھ اسلام کے فکر وعمل کی بہترین خصوصیات جمع کرنی چاہئیں اور اسی لئے جامعہ وجود میں آیا۔ یہی چیز اس درسگاہ کی اصلی خصوصیت ہے۔ جامعہ کے ہر طالب علم کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ یہ حقیقت اپنے دل پر نقش کرے۔ اس کے تمام تعلیمی امتیازات بے سود ہوں گے اگر اسلام کے فکر وعمل کی خصوصیات کا وہ اپنے کو نمونہ نہیں بنا سکے گا۔

ابوالکلام   کلکتہ   ۱۱ ۱۱/۳۰ ع

SEGAON. WARDHA

مورخہ ۹ جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" پڑھی تو میرا دل اُبھر آیا اور یارودہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اسی نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپکا

مو۔ک۔ گاندھی

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور

ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے جس کا گھاؤ مدت مدید میں بھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دُنیا کی نگاہ میں اتنا کم مایہ ہے کہ ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے جن کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

(ڈاکٹر سر) رابندر ناتھ ٹیگور۔

ڈاکٹر سر اکبر حیدری صدر اعظم حکومت دولت آصفیہ

طلبائے جامعہ ملیہ کے ساتھ اپنے وطن کی ایک عظیم الشان ہستی کی یاد تازہ کرنا میرے لئے باعث مسرت ہے۔

اقبال نے ساری دنیا کے لئے ایک نیا پیام دیا ہے۔ اس کی شاعری بنی نوع انسان کے لئے نوید عمل و کامیابی ہے۔ بالخصوص موجودہ زمانہ میں نونہالان ملک کے لئے اس کا عزم افزا نغمہ اس قدر موزوں ہے کہ جس قدر بھی اس کی اشاعت و تبلیغ کی جائے کم ہے۔

مجھے یقین ہے کہ "جوہر" کا یہ مطبوعہ اقبال نمبر ہر طالب علم کے لئے باعث فخر ہوگا اور جو پیام خودداری اس میں مضمر ہے اس پر ہر نوجوان گامزن ہوگا۔

(ڈاکٹر سر) اکبر حیدری

سر تیج بہادر سپرو

جو چیز اقبال کو اکثر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی دقّتِ خیال اور وسعت نظر ہے۔ ان کی شاعری محض روتے جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور پرواز فکر کو اس میں ضائع نہیں کیا کہ کسی تلون مزاج معشوق کے ناز و انداز کے مطالعہ میں سرگرداں رہیں، بلکہ وہ فطرت انسانی کے اعلیٰ، برتر، لطیف جذبات و احساسات کے ترجمان تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ صرف عقلیت ہی انسانیت کی ترقی کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، اسی لئے انھوں نے اپنی ساری اردو اور فارسی شاعری میں انسانی زندگی کے روحانی پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ وہ مشرق اور مغرب کے فلسفہ پر چونکہ عبور رکھتے تھے اور جذبات انسانی کے تاروں کو لطیف انداز میں چھیڑنے کا گر اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی شاعری کی تفسیر میرے نزدیک یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے وہ مسائل جو بظاہر ناقابل حل معلوم ہوتے تھے عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ حقیقی اور سچی محبت کے ذریعہ حل کئے ہیں۔ شعرائے متقدمین اور موخرین میں میرؔ و غالبؔ کے سوا کسی کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ان کی راہ سب سے الگ تھی۔ ان کا میدان سب سے جدا تھا۔ اس میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

(ڈاکٹر سر) تیج بہادر سپرد

ڈاکٹر مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اُردو

اقبال کی شاعری کی خاص غایت تھی. مولانا حالی کی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری سے قوم اور ملک کے جگانے اور رہنمائی کا کام لیا. یہ اس کے خیال اور فکر کی قوت اور جدّت تھی جس نے اس کے کلام اور طرز بیان میں روز اور جوش پیدا کر دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارے ملک پر چھا گیا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے شعر میں ہمیشہ عقل سے نفرت اور جنوں سے رغبت پیدا کرنے کی ہدایت کی، لیکن اس کی ہر نظم عقل و حکمت پر مبنی تھی۔

اس نے ہمیں آزادیٔ فکر اور خود اعتمادی سکھائی اور ایسے توہمات کو توڑا جو گھن کی طرح ہماری قوم کو اندر ہی اندر کھائے جا رہے تھے۔

اس کا کلام اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رہے گا، کیونکہ اس نے مردہ دلوں کو زندہ کیا ہے۔

عبدالحق

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

جوہر، محمد علی جوہرؒ کی یادگار میں قائم ہے، اقبالؒ نمبر نکالنے کا حق اس سے بڑھ کر کس کو حاصل ہے؟

اقبالؒ اور جوہرؒ کا رنگ، عملی دنیا میں ایک دوسرے سے الگ رہا، لیکن نظر اگر سطح سے گزر کر تہ تک پہنچے اور محض عمل نہیں، محرکات عمل سامنے ہوں تو ہر دیکھنے والا دیکھ لے گا کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا، سرشت ایک طینت ایک، قالب دو، روح ایک۔ حُبّ اسلام کے جنوں میں دونوں گرفتار، عشق رسول اسلام کے جام سے دونوں سرشار!

ایک کی سیاست، دوسرے کی شاعری، دونوں اسی ایک رنگ سے رنگین فرق صرف اتنا کہ ایک کے کلام میں حکیمانہ ذوق عرفان، دوسرے کے قلم وزبان میں جوش طوفان، دونوں دنیا میں جیئے تو اسلام کی توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے، دونوں دنیا سے اٹھے تو "آبروے ما زنام مصطفیٰ است" کا وظیفہ جپتے ہوئے!

ایک کے چہرے پر سیاست کا نقاب، دوسرے کے نام کا سخن گویوں کی محفل سے انتساب! حقیقتاً نہ یہ شاعر، نہ وہ سیاسی لیڈر۔ خدا آپ حضرات کو توفیق دے کہ آپ اقبالؒ کے اصلی مقام کو پہچانیں اور کلام اقبال کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر اس کے وسطی اور آخری حصوں کو پڑھ کر اسکی روح و مغز تک پہنچیں۔ مولانائے روم کا "اسم" شاعری کے دیوان میں لکھ لیا گیا، لیکن دنیا جانتی ہے کہ مثنوی کی معنویت کو مشاعرہ والی شاعری سے بھلا کیا نسبت ہے، بس یہی صورت اقبال کے لئے ہے۔ وہ باوجود اتنا بڑا اور مشہور شاعر ہونے کے شاعر نہیں ہے، بلکہ اپنے پیام سے مقام نبوت کی جانشینی کا حق ادا کر رہا ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اقبال شناس ہو جائیں! ع۔ م۔ د

ڈاکٹر بابو راجندر پرشاد سابق صدر آل انڈیا کانگریس

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے اشعار سے ہندوستان میں نئی روح پھونک دی اور ان کے شعر کچھ اتنے ہر دل عزیز ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے سبھی حصوں میں گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی سیاسیات سے لوگوں کو تفرقہ ہو سکتا تھا مگر جو جذبات انھوں نے اپنے اشعار میں ظاہر کئے ہیں اور جو بیداری انھوں نے اپنی شاعری سے پیدا کی ہے اس میں کسی کو کسی طرح کا عذر نہیں ہو سکتا۔ جب آج کی بہت پریشان کن مشکلات طے ہو جائیں گی اور آج کی بہت سی باتیں لوگ بھول جائیں گے، اس وقت سر محمد اقبال کے اشعار ہندوستان کو جگاتے رہیں گے۔

راجندر پرشاد

۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۹ء

Muhammad Iqbal

تعارف

علامہ اقبال مرحوم و مغفور درحقیقت کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کے شاعر نہیں تھے۔ محدود معنوں میں اُنھیں شاعرِ اسلام کہنا بھی ہمارے خیال میں صحیح نہیں۔ وہ ساری انسانیت کے شاعر تھے۔ نفسِ انسانی کی جو عزت، عظمت اور محبت اُن کے دل میں جاگزیں تھی، اس کا رنگ اُن کی کتابِ حیات کے ہر ورق اور ہر سطر سے آشکارا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ مسلمان اُن کے مخاطب تھے اور اسلام کی ترجمانی اُن کا مقصدِ حیات تھا، لیکن اُن کا مطمحِ نظر تمام نوعِ انسانی کو ایک اعلیٰ اور بلند تر مقام تک پہنچانا تھا، جس کے حصول کا اُن کے نزدیک اسلام ایک واسطہ تھا، اُن کو یقین تھا کہ دنیا میں اگر کوئی قوم انسانیت کا صحیح احترام کر سکتی ہے تو وہ مسلمان ہے۔ اُن کا ایمان تھا کہ اسلام ہی دنیا کو تمام بُرائیوں اور مصیبتوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ اُن کے قلب و نظر کی یہی وسعت تھی جس کے لئے ساری دنیا نے خراجِ تحسین ادا کیا۔

ہمارا کیا منہ ہے کہ ایسی عالمگیر شخصیت کو صرف اپنا کہہ سکیں، لیکن اُن کی غیر معمولی محبت اور شفقت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ علامہ اقبال مرحوم جامعہ کے بانیوں میں نہیں تھے، لیکن جامعہ کی بنا میں روحِ اقبال ضرور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے ہمیشہ جامعہ کو اپنا سمجھا اور اس کی نشاۃِ ثانیہ میں حصہ لیا، اور یہی نہیں بلکہ اپنی چند آرزوؤں کا اس کو مرکز قرار دیا۔ یہی تعلق تھا جو اُنھیں بار بار جامعہ میں لایا اور ہماری انجمن کی درخواست کو قبولیت کا شرف دے کر اعزازی

رُکنیت سے سرفراز فرمایا۔ آہ! وہ آفتاب جو مجہول اور گمنام ذرّوں کو بھی محبوب رکھتا تھا، اُسے ہم کیسے بھول جائیں۔

مرحوم کی اچانک وفات ہمارے لئے ایک حادثہ جانکاہ ثابت ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ اپنے محبوب کے بچھڑنے کے بعد اُس کی پس ماندہ چیزوں کی طرف دل کھنچتا ہے اور اُس کی جدائی میں یہ کچھ تسکین و قرار کا باعث ہوتی ہیں، ٹھیک ایسا ہی ہم نے علامہ مرحوم کی وفات کے بعد محسوس کیا کہ ہمارے دل خود بخود اُن کے کلام کی طرف کھنچے جا رہے ہیں۔ پچھلی ششماہی میں ہماری توجہ کا مرکز زیادہ تر اقبال اور کلامِ اقبال رہا ہے، اور اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کا نتیجہ ہے یہ جوہر۔

مدیر

اقبال کے پیام کا متن اور شرح

علامہ سید سلیمان ندوی

شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد مرحوم ایک خوش اوقات صوفی صافی تھے، اور ان کے یہاں آنے والے دوستوں کا مذاق بھی یہی تھا۔ اور اسی ماحول میں اقبال کی پرورش ہوئی۔

سفر کابل کی واپسی میں قندہار کا ریگستانی میدان طے ہو چکا تھا اور سندھ و بلوچستان کی پہاڑوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں، شام کا وقت تھا، ہم دونوں ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے، روحانیات پر گفتگو ہو رہی تھی، ارباب دل کا تذکرہ تھا کہ موصوف نے بڑے تاثر کے ساتھ اپنی ابتدائی زندگی کے دو واقعے بیان کئے۔ میرے خیال میں یہ دونوں واقعے اُن کی زندگی کے سارے کارناموں کی اصل اور بنیاد تھے۔

فرمایا، جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا، تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا، والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے، اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے وہ گذرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا، تو فرمایا، کہ جب امتحان دے لوگے تب، جب امتحان دے چکا اور لاہور سے مکان آیا تو فرمایا، جب پاس ہو جاؤ گے تب، جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔ ایک دن صبح کو جب حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آگئے اور فرمایا، "بیٹا! کہنا یہ تھا، کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے!"

آہ! کیا بات کہی! اور کیسی بات فرمائی! لوگ قرآن کو نقالی سے پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا اُن سے ہم کلام نہیں، یا ایہا الناس! اور یا ایہا الذین اٰمنوا! صرف تیرہ سو برس پہلے کا قصہ ہے جس سے ان کو سروکار نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت میں اُن کا دل تاثر سے خالی رہتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اُن کا یہ فقرہ میرے دل میں اُتر گیا اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

یہ تھا وہ تخم جو اقبال کے دل میں بویا گیا۔ اور جس کی تنا ور شاخیں پہنائے عالم میں ان کے موزوں نالوں کی شکل میں پھیلی ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت کی ہے میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے، باپ نے کہا کسی موقع سے بتاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ بیٹا میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا، بات ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور میں کام شروع کیا، ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا، اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق شوق سے پڑھا اور سُنا، اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا تو ان ہی دنوں میں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کے دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا یا نہیں۔ باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی، کہ جان من! تم نے

میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔
کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبالؔ نے ساری عمر جو پیام ہم کو سُنایا وہ
اِن ہی دونوں متنوں کی شرح تھی۔

مختصر حیاتِ اقبال

محمد حسنین سید متعلم بی۔ اے

کچھ دن پیشتر ڈاکٹر اقبال ہم میں موجود تھے، ان کی بلند پایہ ہستی ہمارے لئے مایۂ صد ناز تھی۔ ہم کو ان کی صحبتوں اور مجلسوں کا لطف حاصل تھا۔ ان کی زیارت دل و دماغ کو روشنی اور روح کو فرحت و انبساط بخشتی تھی۔ ہم ان کے ارشادات اور فرمودات سے فیضیاب ہوتے تھے، اُمید تھی کہ یہ سلسلہ ابھی کچھ اور جاری رہے گا، اور یقین تھا کہ ہم ابھی دورِ حاضرہ کے اس بلند مرتبہ حکیم اور فلسفی انسانیت کے سچے ہمدرد مسلم اور دنیائے اسلام کے ایک مایۂ ناز فرزند سے کچھ اور کسبِ فضیلت کر سکیں گے۔ لیکن افسوس! این درچہ خیالم و فلک درچہ خیال۔ ۲۱ر اپریل کی صبح نے ہماری تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کر دیا، اور ملت کا وہ درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند؟

ساقی یقیناً نہیں رہا مگر قدح ہنوز باقی ہے۔ یہ سچ ہے آج ہم میں ڈاکٹر اقبال نہ رہے، ان کی صحبتیں اور مجلسیں نہ رہیں، مگر ان کا حیات بخش پیام ہم میں باقی ہے، جو ولولہ تازہ انہوں نے ملت کو بخشا ہے وہ سلامت ہے، ان کی گرم نوائی اور آہِ سحر گاہی ابھی فضا میں موجود ہے، ان کی درد لیشانہ اور قلندرانہ زندگی ہمارے لئے مثال ہے۔ اگر ہم میں کچھ احساس پیدا ہو گیا ہے، اگر ان کی بانگِ درا نے ہم کو غفلت سے کچھ چونکایا ہے، اگر ان کی نالۂ نیم شبی نے ہمارے بےحس قلوب پر کچھ اثر کیا ہے۔ اگر ان کی ضربِ کلیمی نے ہمارے

دل کے بتوں کو توڑ ڈالا ہے، اگر ان کے بالِ ملکوتی کے سہارے ہماری پست ذہنیتیں کچھ بلند ہوئی ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی وفات پر ماتم ہی کرتے رہیں۔ بلکہ ہمارے لئے لازم ہے کہ ان کے زندگی بخش پیام کو سمجھیں اور سمجھائیں۔ ان کا سا فضل و کمال اور ان کی سی نور بصیرت اپنے میں پیدا کریں، اُن کا سا سوز و ساز، اُن کی تب و تاب ہم آپس میں بانٹ لیں، ان کے نالۂ نیم شب کا نیاز، ان کی خلوت و انجمن کا گداز ہم لے لیں، ان کی امنگیں اور آرزوئیں، اُن کی امیدیں اور جستجوئیں ہم حاصل کریں، یہی کچھ اس فقیر کی متاع تھیں۔ جو ہمیں عطا کرنا چاہتا تھا ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے　　لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے

دنیا کو ڈاکٹر اقبال جیسی نادر ہستیاں صدیوں کے بعد میسر آتی ہیں۔ جب لوگ عام طور سے اقبال کے کلام کو سمجھنے لگیں گے تو ان کے حالات کی چھان بین کی جائے گی، ان کی زندگی کی تفصیلات کی جستجو ہوگی، ایک ایک لمحہ کے حرکات و سکنات درج کیے جائیں گے، جس کا شمار بھی مشکل ہو جائے گا۔

اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، ان کے آبا کا اصلی وطن کشمیر تھا، جہاں سے دو سو سال پہلے ان کے جد امجد ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آ بسے تھے، اقبال کے دل کو کشمیر کی یاد اکثر گدگداتی تھی ؎

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے　　اس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ارم کی ہے جائداد　　جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

اقبال کے مورث کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ ایک ولی

کے ساتھ حسن عقیدت ہو جانے کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے ؎

ہیں اصل کا خاص سومناتی　　آبا مرے لاتی و مناتی
مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی　　برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

جس زمانہ میں اقبال پیدا ہوئے وہ مسلمانوں کے لئے کچھ عجیب فلاکت وادبار کا زمانہ تھا، دنیائے اسلام نزع کی حالت میں مبتلا تھی، ہندوستانی ۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد ہمت ہار کر ہتھیار ڈال چکے تھے۔ مسلمانوں پر بغاوت کا الزام لگا کر ان کی بری طرح سرکوبی کی گئی تھی، اور بظاہر ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں باقی تھے۔ سر سید اور ان کے رفقاء ان کو جھنجوڑ کر اٹھانے کی کوشش پیہم کر رہے تھے، مگر ان میں کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ دنیائے اسلام کا بھی یہی حال تھا۔ مسلمان حکمراں یا غیر ملکیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے یا اپنی رعایا کے لئے نہایت جابر و قاہر، خود عیش و عشرت میں سرشار اور رعایا جہالت و افلاس میں سرمست، یورپ کے گدھ ان کو مردار سمجھ کر ان پر ہر طرف سے لوٹ پڑے تھے۔ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر رحم کرتے ہوئے ان کی اصلاح و سدھار کے لئے دنیائے اسلام میں چند باکمال ہستیوں کو مامور کیا۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال، ایران میں رضا شاہ پہلوی، مصر میں زاغلول پاشا، ہندوستان میں محمد علی اور ابوالکلام وغیرہ پیدا کئے۔ ان میں کسی نے تو موقعہ مناسب مل جانے کی وجہ سے اپنا کام پورا کر لیا کسی نے کام کو شروع کر دیا مگر مکمل نہ کر سکے، اور کچھ تکمیل کے لئے شب و روز کوشاں ہیں۔ امت کی یہ اصلاح و سدھار الگ الگ وطنی، قومی اور نسلی بنیادوں پر ہوئی۔ اب ضرورت ایک ایسے معمار کی تھی جو ان مختلف اینٹوں سے ابراہیمی و مصطفوی بنیادوں پر ایک نئے حصار ملت کی تعمیر کرے۔

اللہ نے اس کام کے لئے اقبال کو ہندوستان میں ۱۸۷۵ء میں پیدا کیا۔

اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ ان میں مذہبیت اور دینداری بہت تھی۔ ان کے بڑے بھائی حکومت کے ایک ممتاز عہدہ دار تھے۔ اقبال کی تربیت کا سہرا ان ہی بزرگوں کے سر ہے۔ اقبال کی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی۔ ذہن اور حافظہ خداداد تھا۔ مڈل سے جو امتیاز، انعام تمغے اور وظیفے حاصل کرنا شروع کیا، تو ایم، اے تک کرتے ہی چلے گئے۔ "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" اس طرح اپنی تعلیم کے بارے اپنے والدین کو بلکا رکھا۔ ایف، اے تک کی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ وہاں ان کو ایک شفیق استاد شمس العلما مولوی میر حسن مل گئے۔ جو عربی فارسی میں عبور رکھتے تھے، اور ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ اپنے شاگرد کو جو مضمون پڑھاتے اس کا اس میں صحیح مذاق پیدا کر دیتے۔ اقبال نے حتی الوسع خوب استفادہ کیا۔ بی، اے کی تعلیم کے لئے لاہور آنا پڑا۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ ہوا۔ فلسفہ اختیاری مضمون پسند کیا۔ حسن اتفاق سے وہاں ایک فاضل مستشرق پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہوئی۔ ان کو فلسفہ کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ جوئندہ یابندہ، اقبال نے ان سے بھی اچھی طرح کسب فضیلت کیا۔ آپس کے تعلقات ایسے بڑھے کہ شاگردی دوستی کی حد تک پہنچ گئی۔ جب آرنلڈ صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو اقبال نے "نالۂ فراق" کے عنوان سے آرنلڈ صاحب کی یاد میں ایک نہایت مؤثر نظم لکھی اور بالآخر ۱۹۰۵ء میں آرنلڈ صاحب کی کشش نے اقبال کو انگلستان کھینچ لیا۔

خوش قسمتی سے اقبال کو اپنے علمی منازل طے کرنے کے لئے بہت اچھے اچھے رہبر ملے اور بڑے بڑے علماء سے سابقہ پڑا، انگلستان پہنچ کر کیمبرج

یونیورسٹی میں داخلہ کرایا۔ وہاں ڈاکٹر میک ٹیگرٹ براؤن نکلسن اور سارمی جیسے فضلا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اقبال نے ان کے گلشن علم و ادب سے خوب گلچینی کی کیمبرج یونیورسٹی سے بذریعہ تحقیقات علمی، فلسفہ اخلاق کی ڈگری لی۔ پھر جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے ایک کتاب فلسفۂ ایران لکھنے پر پی، ایچ، ڈی کا فرسٹ کلاس ڈپلوما حاصل کیا۔ اس کتاب پر انگلستان کے مشہور پرچوں میں بڑے بڑے اہل الرائے کے تبصرے شائع ہوئے اور کتاب یورپ میں مقبول ہوئی، جرمنی سے پھر لندن واپس آئے اور وہاں اسکول آف پولٹیکل سائنس میں داخل ہوئے، وہاں سے فراغت کے بعد بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ انگلستان کے دوران قیام میں اسلام پر چھ پبلک لکچر دیئے جو بہت مقبول ہوئے، لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے چھ مہینے تک عربی کے پروفیسر بھی رہے، یہ شرف کسی ہندوستانی کو شاید ہی حاصل ہوا ہوگا۔

سنہ۰۸ء میں تین سال کی کامیاب کوششوں کے بعد اقبال وطن لوٹے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲، ۳۳ رسال کی تھی۔ اس عمر میں اتنے علمی اعزازات اور ڈگریاں اللہ کی دین ہیں۔ اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت اور یورپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونا کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ اس عمر میں شہرت اور مقبولیت کی اس بلندی پر پہنچ جانا کچھ کم قابل رشک نہیں۔

اقبال جب ولایت جا رہے تھے تو دہلی میں حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ میں حاضر ہوئے اور "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک دعائیہ قصیدہ بطور نذرانے کے ان کی جناب میں پیش کیا، جس کا ایک شعر اقبال کے میلان طبع اور اور فطرت سلیم کا پتہ دیتا ہے ؎

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی　　　　مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی — بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم گلِ بہار توام

اقبال کے دل میں بزرگوں کی یہ ارادت اور عقیدت آخر عمر تک باقی رہی۔ آگے چل کر اقبال اپنے سفر کی غرض و غایت بتاتے ہیں، اور ان کے توسط سے اللہ سے دعا مانگتے ہیں ؎

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر — تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
پھر آرکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اقبال کی یہ دعا جس طرح حرف بہ حرف مقبول ہوئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ مسافر جب تین سال کے بعد یورپ سے لوٹتا ہے تو پھر اسی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اس درویش کے آستانہ پر حاضر ہو کر اپنی محبت اور اپنی پرانی عقیدتمندی کا اظہار کرتا ہے۔ یورپ کی آب و ہوا اس کی تہذیب و تمدن اور نئے علوم ہندوستان سے جانے والے اکثر طالب علموں کی قلب ماہیت کر دیتے ہیں مگر یہ اقبال پر مطلق اثر انداز نہیں ہوتے ؎

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اقبال دہلی سے گذر کر انبالہ رُکے اور اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر اعزہ واحباب کا جمگھٹا تھا، اسی دن شام کو ان کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی، دوسرے دن سیالکوٹ پہنچ کر اپنے ماں باپ کے قدموں پر پیشانی رکھی۔

اقبال جب ایم۔ اے پاس کر چکے تھے تو اورنیٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرار مقرر ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر ہوگئے، اور اپنے فرائض کو بہت حسن وخوبی سے انجام دیتے رہے۔ اکثر طالب علموں کو اپنے گھر پر پڑھایا کرتے۔ علمی مشاغل ان کی زندگی کے لئے لازمی عنصر ہوگئے تھے۔ جب اقبال یورپ سے واپس آئے تو کچھ دنوں بدستور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے، پھر اس کے بعد وکالت شروع کی، مگر وکالت کو اقبال کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں حاصل ہے۔ وہ محض کسب معاش کا ایک ذریعہ تھی۔ جو کچھ اس سے ہاتھ آجاتا اس پر قناعت کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ جو کچھ کماتے جب تک وہ خرچ نہ ہوجاتا، عدالت کا منہ نہ دیکھتے، اور جو وقت اس طرح بچتا وہ کتب بینی، غور وفکر، ملت کی حالت سدھارنے اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے ذرائع سوچنے میں گذارتے۔ ان کی زندگی کی ساری کمائی ان کے کلام کے وہ چند مجموعے ہیں جو آج ملت کے لئے گراں بہا اور قابل فخر خزانہ ہے۔

اقبال ذہنی طور پر فرقہ بندی سے بہت بلند تھے، ان کی ہمدردی، آزاد اور ترقی پسند طبقہ کو حاصل تھی مگر وہ عملی سیاست میں قدم رکھنا نہیں جانتے تھے۔

یہ عقدہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیضِ عشق سے ناخن ہمارا ہے سینہ خراش

لیکن ان کے دوستوں نے باصرار ۱۹۲۶ء میں کونسل کے انتخابات کے لئے اُمیدوار کھڑا کیا اور وہ کثرت رائے سے کامیاب ہوگئے۔ کونسل میں تا حد امکان مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا دردمند دل غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی سود و بہبود کے لئے ہمیشہ بیقرار رہا، اور کونسل کے مختلف اجلاسوں میں ان کے فائدے کی بہت سی تحریکیں پیش کیں، اور اس قسم کی تمام تحریکوں کی پرزور تائیدیں کیں۔ ایک تحریک پیش کی کہ ملک کا ایک طبقہ اکثر مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر کمینے حملے کیا کرتا ہے، گورنر جنرل با جلاس کونسل سے سفارش کی جائے کہ اس قسم کی حرکتوں کے سدباب کے لئے کوئی قانون نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ایک قانون ۱۹۲۷ء میں منظور ہوکر نافذ ہوگیا۔ تلوار کا اسلحہ ہند سے مستثنےٰ کرنے اور حکومت کو شراب نوشی کے انسداد کی حکمت عملی اختیار کرنے کی تحریک بھی آپ نے پیش کی وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۲۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے چند لکچر دینے کے لئے آپ کو مدعو کیا، آپ آخر دسمبر میں وہاں تشریف لے گئے۔ اس سلسلہ میں اور بھی کئی مقامات میسور بنگلور اور سرنگاپٹم کی سیر کی مختلف افراد، اداروں اور انجمنوں کی طرف سے آپ کی دعوتیں ہوئیں، اور بیشمار سپاسنامے آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے، آپ نے وہاں کی یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیئے۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن نے بھی ملنے کی دعوت دی۔ آپ شاہی مہمان ہوکر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی شاہانہ مہمان نوازی کی گئی اِس دوران میں حیدر آباد، میسور اور مدراس کے اخباروں نے آپ کے فضل و کمال پر مقالات لکھے اور بعض نے اقبال نمبر شائع کیا۔

۱۹۳۱ء میں حکومت ہند کی دعوت پر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ واپسی میں اسپین، فرانس، اٹلی اور فلسطین کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان لوٹے۔ اس سفر میں یورپ سے ہمارے لئے جو تحفہ لائے وہ بہت ہی قابل قدر ہے۔ بال جبریل کی اکثر نظمیں اسی سفر میں لکھی گئیں۔ اسپین کی سیاحت اور اسلامی عہد کے آثار جامعہ قرطبہ، کھنڈرات و عمارات کا ان کے دل پر بہت اثر پڑا۔ جو نظمیں قرطبہ میں لکھی گئی ہیں بڑی دلچسپی اور بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کی مستحق ہیں۔

اسی سال آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے، الہ آباد میں اس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں انہوں نے ہندوستانیوں کے آپس کے مناقشات دور کرنے کے لئے پاکستان کی معرکۃ الآرا تجویز پیش کی جس سے آج کل بڑی دلچسپی لی جا رہی ہے۔

۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان نے اپنے ملک کی تعلیمی اصلاحات کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے آپ کو کابل آنے کی دعوت دی، آپ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور سر راس مسعود مرحوم کے ساتھ افغانستان تشریف لے گئے۔ اس سلسلہ میں ملک کے دوسرے حصوں کی سیر کی۔ مختلف شاہ و گدا کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ قندھار میں خرقہ مبارک کی زیارت کی، اس کے تاثرات کو آپ نے فارسی میں منظوم کیا ہے۔ مسافر کے نام سے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

عملی سیاسیات سے اقبال کی دلچسپی برائے نام تھی۔ مگر ادھر چند سال

سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ وکالت بھی چھوڑ دی تھی اور گوشہ نشین ہو کر زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ اپنی تصانیف سے جو کچھ آمدنی ہوتی اُس پر گذارہ تھا۔ خرچ بہت تھا ــــــــــ، کئی آدمیوں کی پرورش کے علاوہ ایک لڑکے جاوید سلمہ کی تعلیم کے مصارف برداشت کرنے پڑتے تھے، کتابوں پر بھی ایک کثیر رقم صرف کرتے تھے۔

چند سال ہوئے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے ان کے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے، انہوں نے از راہ قدردانی و علم پروری پانچسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا جس سے ان کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ سال بیشتر ان کو اپنی تصانیف سے یک مشت تقریباً ۲۵-۳۰ ہزار کی رقم مل گئی تھی، جس سے اُنھوں نے اپنے چھوٹے بچے کے نام سے ایک مکان جاوید منزل میکلوڈ روڈ پر بنوالیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کا مکان دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ کہنے کے لئے تو کوٹھی ہے مگر اپنی سادگی اور بے سروسامانی کے لئے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کوٹھی کے ایک گوشہ میں چارپائی پر کبھی لیٹے، کبھی تکیوں کے بل بیٹھے دن بھر حقہ پیا کرتے تھے۔ چار پانچ سال سے ان کو بیماری نے اور بھی بالکل مجبور کر دیا تھا۔ گلے سے آواز بڑی تکلیف سے نکلتی تھی، بصارت کم ہو چکی تھی، موتیا بند کا مرض تھا، اس کا آپریشن کرانا چاہتے تھے۔ کمزوری و ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ بمشکل گھر سے نکل کر صحن میں آکر بیٹھتے۔ نواب صاحب بھوپال نے ان کو علاج کی خاطر بھوپال بلالیا تھا۔ کچھ دنوں وہاں رہے۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو پھر لاہور چلے آئے اور وہیں علاج جاری تھا۔ امید تھی کہ افاقہ ہو جائے گا۔ اس حالت میں بھی اس فدائے ملت کے ارادے اور حوصلے قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔ اس بیماری کے عالم ہی میں جب بھوپال میں علاج کرا رہے تھے تو بہت سی نظمیں لکھیں جو ضرب کلیم میں شائع

ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ نثر میں موجودہ حالات کے مطابق ایک فقہ اسلامی مرتب کرنے کا خیال تھا، اس کے لئے مشرق و مغرب سے مواد اکٹھا کر رہے تھے، لیکن افسوس موت نے اس کا موقع نہ دیا، ورنہ ملت کو اسلامی اور سیاسی زندگی کا ایک ایسا دستور مرتب کر کے دے جاتے جو ملت اسلامیہ کے موجودہ انتشار و بےچینی کے لئے جیسا کچھ مفید ثابت ہوتا اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ آپ اکسفورڈ یونیورسٹی کی فرمائش پر روڈس لکچر کے سلسلہ میں بھی چند خطبات دینے والے تھے۔

کئی سال سے آپ زیارت بیت اللہ و حرم نبویؐ کا ارادہ رکھتے تھے۔ پچھلے سال یوم اقبال کے موقع پر جب استاذی مولانا اسلم صاحب لاہور تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب سے ملے تھے، ڈاکٹر صاحب نے اُن سے فرمایا۔ کہ میں دو سال سے ارادتاً حج میں ہوں۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے تھے جو سفر سے متعلق ہیں اور ان میں سے کہیں کہیں سے سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کو روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزل دوست

کہتے ہیں کہ یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ افسوس! ان کو بیت اللہ اور حرم نبویؐ کی زیارت کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ حجاز سے ہمارے لئے کیا کچھ تحفہ لاتے جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ لوگ کعبہ کی زیارت کے لئے حجاز جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جن کی زیارت کے لئے کعبہ خود آتا ہے۔ سچ ہے اگر یہ نہ ہوتا تو کیسے اپنے سفر سے متعلق پیشگی اشعار لکھ لیتے ـــــ ان اشعار کے مجموعہ کا نام ارمغان حجاز ہے۔

اقبال آخر عمر میں حُب نبیؐ میں بالکل ڈوب گئے تھے جیسا کہ اوپر کے واقعہ سے ظاہر ہوا ہوگا وہ اپنے عیوب و گناہ خداوند علیم و خبیر سے کیسے پوشیدہ رکھ سکتے تھے پھر اس کی غفاری اور ستاری سے کچھ اطمینان بھی تھا۔ مگر وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ روز محشر ان کے گناہ کسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر ہو جائیں چنانچہ ان ہی دنوں ایک نہایت پرسوز و مؤثر رباعی ان کی زبان سے نکلتی ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روز محشر عذرہائے من پذیر

تو اگر بینی حسابم ناگزیر — از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اسی زمانہ میں وہ انگریزی زبان میں "بھولا ہوا پیغمبر" (Forgotten Prophet) کے عنوان سے ایک نظم لکھنا چاہتے تھے۔ کاش اگر وہ نظم لکھی جاتی تو انگریزی زبان کا بھی ایک شاہکار اور غیر فانی نظم ثابت ہوتی۔

جب اقبال کی شہرت بہت عام ہوگئی، ان کی کتاب "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کا یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور ان کے علم و فضل کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجنے لگا تو حکومت ہند نے بھی از راہِ قدردانی بڑے اعزاز و اکرام سے سب سے بڑا خطاب "سر" ان کو پیش کیا، اور انھوں نے اس کو قبول کیا۔ اس پر لوگوں کو اعتراض ہے کہ اقبال جیسے حریت پسند اور آزاد انسان نے اس کو کیونکر قبول کیا۔ پھر ان پر یہ بھی الزامات ہیں کہ ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر ایک المیہ ترکیب بند لکھا۔ گورنر کی شان میں قصیدہ لکھا، ان کی ساری زندگی سرکار پرستوں کے ساتھ گذری۔ ع ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو، بات یہ ہے اقبال ایک بہت بلند مرتبہ انسان تھے، ان کا دل فرقہ پروری سے پاک تھا۔ اور دوست دشمن ان کی نظروں میں یکساں۔ وہ قدر شناسی میں بہت فیاض واقع ہوئے تھے، اگر کوئی ان کے ساتھ معمولی احسان کرتا تو

زندگی بھر اس کے احسان کو مانتے، اگر وہ کسی میں کوئی خوبی دیکھتے تو بڑی فراخدلی سے اس کا اعتراف کرتے، انھوں نے شیطان کی خودی کو بھی سراہا ہے، اور مسولینی جیسے خونخوار انسان کی ندرت فکر و عمل کی بھی داد دی ہے۔ اقبال کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی نظر کسی برائی کی نسبت اچھائی پر زیادہ پڑتی ہے۔ ان کا قلم کسی ہجو لکھنے سے بالکل پاک ہے۔ زندگی بھر "میری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے" پر عمل رہا ہے۔ اس لئے ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر جن کے بعض ذاتی اوصاف مُسلّمہ ہیں اگر کوئی دردانگیز ترکیب بند ان کے قلم سے نکل جاتا ہے۔ یا کسی انگریز کے کسی اخلاق سے متاثر ہو کر کوئی مدحیہ قطع لکھ دیتے ہیں یا کوئی دشمن ان کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا ہے، اور وہ اپنی اس اعلیٰ ظرفی سے کام لے کر اس کو قبول کر لیتے ہیں تو اس میں تعجب کی بات نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ اوروں کی طرح "سر" ہو کر واقعی حکومت کے آلہ کار بن گئے؟ اس کے لئے ہم کو ان کی زندگی پہ نظر ڈالنی ہوگی۔ ہم ان کی ساری زندگی ٹٹو لتے ہیں اور عاجز و درماندہ رہ جاتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی تو ایک رندمشرب صوفی اور درویش کی سی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی بھر ان کی زبان پر یہ شعر رہا، اور اس کی دوسروں کو تلقین بھی کرتے رہے ؎

اے مرے فقر غیور فیصلہ تیرا ہے کیا   خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت   فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

برخلاف اس کے ان کے ساتھی "سر" سے کیا کچھ ہو گئے، اگر افریقہ کی ایجنسی ان کو پیش بھی کی جاتی ہے تو اس کو قبول نہیں فرماتے۔ اس قسم کے بہت سے مواقع نام و ثروت

کے زندگی میں ان کو حاصل ہوئے۔ مگر وہ ہمیشہ ان سے احتراز کرتے رہے۔

ڈاکٹر اقبال کیا تھے؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ کہنے کیلئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا کے ایک بہت بڑے انسان، دورِ حاضر کے ایک بلند پایہ حکیم و فلسفی، دنیا پر خودی کا راز فاش کرنے والے، انسانوں کو آدابِ جنوں و خود آگاہی سکھانے والے، غلاموں کو اسرار فقر و شہنشاہی سمجھانے والے، مسلمانوں کو شانِ مومن بتانے والے، حقیقت کے ترجمان، انسانیت کے معلم، وطن کی عزت، ایشیا کی آبرو، ملت کی شان وغیرہ وغیرہ لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں انسانِ کامل کی ایک جھلک پائی جاتی تھی، وہ خوددار فقیر، پکے مومن اور عاشقِ رسول تھے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو ایک ولولہ تازہ بخشنے، انسانیت کو حیاتِ نو عطا کرنے اور غلاموں کو درسِ خودی دینے کے لئے مامور ہوئے تھے اور ہم اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ بحمد اللہ اِس حکیمِ مشرق نے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا، اب اُن کے کام کی تکمیل اور اس کے نتائج سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے خدا ہم کو اس کی توفیق دے۔

عقل و عشق

اقبال کی شاعری میں

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

عقل و عشق کی کشمکش اردو اور فارسی شاعری کا پرانا مضمون ہے عشقیہ شاعری میں عقل مصلحت اندیشی اور احتیاط کے معنی میں آتا ہے اور عشق اس والہانہ محبت کے معنی میں جو آداب مصلحت سے نا آشنا اور وضع احتیاط سے بیگانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

عشق در آمد ز در گفت سلامٌ علیک　　عقل بروں شد ز سر گفت سلامٌ علیک

متصوفانہ شاعری میں عقل سے مراد ہے منطقی استدلال جس کے ذریعہ سے ظنّی مظاہر کا ایک دھندلا سا تصور قائم ہوتا ہے، اور عشق سے مراد ہے جذب باطن جس کی بدولت طالب تعینات کے پردوں کو ہٹا کر حقیقت کی بلا واسطہ معرفت حاصل کرتا ہے۔ عقل کی کوششوں کا ماحصل علم یا "خبر" ہے۔ یعنی ذہنی ادراک اور عشق کی منزل معرفت یا "نظر" یعنی وجدانی مشاہدہ۔ اگر ہم عقل و ادراک سے حقیقت کے عقدے کو حل کرنا چاہیں تو تصورات کا ایک لامتناہی سلسلہ بن جاتا ہے۔ ہر تصور کی تشریح کے لئے ایک نئے تصور کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ نیا تصور پھر ایک نئی تشریح کا محتاج ہوتا ہے۔ غرض یہ عقدہ کبھی حل نہیں ہوتا، بلکہ اور نئی نئی گتھیاں پڑتی چلی جاتی ہیں۔

فلسفی راز حقیقت نہ توانست کشود　　گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

اس عقدے کو حل کرنے کی یعنی وجود حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم ذوق و شوق سے ریاضت جسمانی اور مجاہدہ نفس کے مرحلے طے کرکے وہ نظر پیدا کریں جو ہمیں شاہد حقیقت کا جلوہ دکھاتی ہے۔

آدمی دیداست باقی پوست است!　　دید آں باشد کہ دید دوست است

جملہ تن را در گداز اندر بصر　　در نظر رو در نظر رو در نظر

اقبال نے عقل اور عشق کے تصورات صوفی شاعروں سے لے کر ان پر جدید فلسفہ وجدانیت کا رنگ چڑھایا ہے اور اپنی جدت فکر سے ان کے تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

صوفی شعرا "ہمہ اوست" کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی وجود صرف ذات الٰہی کا ہے۔ کائنات کا وجود محض ہمارے حواس ظاہری کا فریب ہے۔ اس لئے عقل جس سے ہمیں کائنات کا علم حاصل ہوتا ہے ان کی نظر میں کوئی قدر نہیں رکھتی۔ مگر جدید فلسفہ وجدانیت جس کا سب سے ممتاز نمائندہ فرانسیسی فلسفی برگساں ہے، عقلی تصور کائنات کی عملی قدر کو تسلیم کرتا ہے۔ برگساں کہتا ہے انسان کے ذہن کا کام یہ ہے کہ حسی وظائف کو حرکتی وظائف میں منتقل کردے، اس لئے جو تصور کائنات ذہن و حواس سے حاصل ہوتا ہے وہ عملی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن یہ تصور حقیقت کا تصور نہیں ہے۔ حقیقت کی معرفت عقل و حواس کے واسطے کے بغیر باطنی وجدان سے حاصل ہوتی ہے جس میں موضوع اور معروض کا فرق مٹ جاتا ہے اور نفس انسانی بیگانگی کے پردوں کو ہٹا کر اس حقیقت کا جس کا وہ خود ایک

جزو ہے بلا واسطہ محروم ہو جاتا ہے۔

اقبال برگسان کی زبان سے کہتے ہیں :۔

تا بر تو آشکار شود راز زندگی | خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہِ آشنا میار | بر مرز و بوم خود چو غریبان گذر مکن

نقشے کہ بستہ محض اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

اب اسی مضمون کو خود اقبال کی زبان سے سُنئے :۔

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا | بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی | مظہر شان کبریا ہوں میں
دل نے سُن کر کہا یہ سب سچ ہے | پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے | اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے | اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے | تو خدا جو، خدا نُما ہوں میں
تو زماں و مکاں سے رشتہ بہ پا | طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا | عرش رب جلیل کا ہوں میں

ان اشعار سے عقل اور عشق کا وہ تصور جو اقبال کے ذہن میں ہے، واضح ہو جاتا ہے۔

(۱) عقل راز ہستی کو "سمجھتی ہے"۔ یعنی مظاہر کی صورت میں اس کا بلا واسطہ ادراک کرتی ہے اور عشق اسے "آنکھوں سے دیکھتا ہے" یعنی حقیقت ہستی کا بلا واسطہ مشاہدہ کرتا ہے۔

عقل زمان و مکان کی پابند ہے اور یہ صرف مظاہر کے ادراک کی صورتیں ہیں۔ اس لئے عقل کے ذریعہ سے ہمیں صرف "علم" حاصل ہوتا ہے۔ عشق زمان و مکاں کی حدود سے نکل کر اس عالمِ نامحدود میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں حقیقت مطلق بے حجاب نظر آتی ہے اور یہ "معرفت" کا مقام ہے۔
(۲) عقل کی منزل مقصود بھی ہستئ مطلق کی معرفت ہے۔ وہ "خداجو" ہے لیکن اس کی جستجو بجائے خود نا تمام ہے۔ عشق "خدا نما" ہے یعنی راہ طلب میں عقل کی رہبری کرتا ہے اور اُسے منزل تک پہنچا دیتا ہے عقل اور عشق ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ دراصل عشق عقل کا مرشد ہے۔

اب ہم اقبالؔ کے تصورِ عقل و عشق کے ان دونوں پہلوؤں یعنی ان کے اختلاف اور اتحاد کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(۱)

عقل کی کل کائنات "خبر" یعنی مظاہر کا علم ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ نہیں

اس کا ادراک صورتِ زمانہ اور حواسِ ظاہری کا پابند ہے اس لئے وہ کعبۂ حقیقت سے نا آشنا اور صنم خانۂ مجازی کی پرستار ہے۔

خرد زنجیری امروز و دوش است ۔۔۔ پرستارِ بتانِ چشم و گوش است
صنم در آستیں پوشیدہ دارد ۔۔۔ برہمن زادۂ زنار پوش است

عقل کا علم جو مشاہدۂ حقیقت سے محروم ہے ظن و گمان سے زیادہ نہیں۔ انسان کا دل محض گمان سے مطمئن نہیں ہوسکتا بلکہ یقین حاصل کرنے کے لئے بےچین ہے۔

چو خس از موج ہر بادے کہ می آید زجا رفتم
دل من از کمال بہار خروش آمد یقینے دہ

کائنات کا سطحی علم بیکار ہے جب تک انسان کی نظر اس کی تہ تک نہ پہنچ جائے۔

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نہ روی
نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است

عقل کی بصارت کے ساتھ عشق کی بصیرت بھی شامل ہو تو کائنات جسے خود محرم راز کی تلاش ہے اپنے اسرارِ پنہاں آشکارا کر دیتی ہے۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرے ذرے میں ہے ذوقِ آشکارائی

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

کائنات کی حقیقت معلوم کرنے کی جو لگن انسان کے دل میں ہے، وہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی رو سے محض نظری اہمیت نہیں بلکہ اخلاقی اور عملی اہمیت رکھتی ہے۔ انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی توسیع اور تکمیل کرے اور اُسے پائدار اور لازوال بنائے۔ عقل کو اس مقصد کا احساس تک نہیں وہ کشمکشِ حیات کا دور سے تماشا دیکھتی ہے مگر عشق جو پیغامِ خودی کا مخاطب اور محرم ہے، بے تامل کارزارِ عمل میں کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

اس مقصد کے حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرے اور زمانہ کی قیود کو توڑ کر اپنی زندگی کو لازوال بنا دے۔

حیات چیست جہاں را اسیرِ جاں کردن
تو خود اسیرِ جہانی کجا توانی کرد

تو از شمارِ نفس زندۂ، نمی دانی
کہ زندگی ز شکستِ طلسمِ ایام است

ظاہر ہے کہ "شکست طلسم ایام" عقل کے بس کی بات نہیں اس لئے کہ وہ تو اپنی فطرت کی رو سے صورتِ زمان و مکان کی پابند ہے یعنی اس پر مجبور ہے کہ عالم خارجی کے تصور کو مکان کے سانچے میں اور عالم داخلی کے ادراک کو زمانے کے سانچے میں ڈھالے۔ وہ مظاہر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتی ہے اور آہستہ آہستہ ایک ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اسی لئے وہ کائنات کو نامحدود سمجھتی ہے اور اس کے احصار سے عاجز ہے ان قیود کو توڑ کے لازمان و لامکان کا مشاہدہ کرنے کے لئے عشق کی جرأت رندانہ درکار ہے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اس مطلب کو اقبال نے جاوید نامے میں ایک تمثیل کے پیرائے میں ادا کیا ہے۔ جب شاعر زندہ رود اپنے پیر طریقت مولانا روم کے ساتھ عالم علوی کی سیر کو جانا چاہتا ہے تو روح زمان و مکان جس کا نام زروان ہے ظاہر ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ میں طلسم کائنات کی محافظ ہوں۔ اس طلسم کو وہی توڑ سکتا ہے جو صدق دل سے "لی مع اللہ وقت" کہے یعنی صرف عشق الہٰی کی توفیق سے زمانے کی حدود سے گذر کر ابدیت کی نامحدود فضا میں قدم رکھنا ممکن ہے۔

گفت زروانم جہاں را قاہرم
ہم نہانم از نگہ ہم ظاہرم
من حیاتم من مماتم من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حور
در طلسم من اسیر است ایں جہاں
از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست
آں جوانمردے طلسم من شکست
گر تو خواہی من نہ باشم درمیاں
لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

زروان سے آنکھ ملاتے ہی شاعر کے سامنے زمان و مکان کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ تعینات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور عالم حقیقت بے حجاب نظر آنے لگتا ہے۔ یہ واردات قلب خود شاعر کی زندگی میں کایا پلٹ کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عالم میں مر کر ایک اور عالم میں پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے جسم و روح میں ایک عجیب لطافت اور اپنی چشم باطن میں ایک نئی بصیرت پاتا ہے۔

در نگاہ او نمی دانم چہ بود | از نگاہم این کہن عالم ربود
مُردم اندر کائناتِ رنگ و بو | زادم اندر عالمے بے ہائے وہو
رشتۂ من زاں کہن عالم گست | یک جہانِ تازہ آمد بدست
از زیانِ عالمے جانم تپید | تا دگر عالم زخاکم بردمید
تن سبک تر گشت و جاں ہشیار تر | چشم دل بینندہ و بیدار تر

یہی وہ کیفیت ہے جس میں شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

نہ بامروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بدوش | نہ نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم

در جہانِ دلِ ما دورِ قمر پیدا نیست | انقلابیست ولے شام و سحر پیدا نیست

بہ گوشِ من رسید از دل سرودے | کہ جوئے روزگار از چشمہ سارم
ازل تاب و تبِ دیرینۂ من | ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

(۲)

ان سب اشعار میں اقبال کے پیش نظر عقل کا مروجہ تصور تھا، یعنی وہ قوت

جو حواس ظاہری کی مدد سے زمان و مکان کے دائرے کے اندر مظاہر کا علم و ادراک حاصل کرنے پر قناعت کرتی ہے۔ لیکن خود ان کا تصوّرِ عقل اس سے جُدا ہے۔ ان کے نزدیک عقل حقیقت میں عشق کی ضد نہیں بلکہ اس کی تمہید ہے۔ اگر وہ صحیح راہ پر چلے تو ہمارے دل میں مشاہدۂ حقیقت کی آرزو پیدا کرتی ہے اور اس طرح اس کی حد عشق سے جا ملتی ہے۔ وہ "خبر" پر قانع نہیں بلکہ ذوقِ "نظر" بھی رکھتی ہے لیکن اس کی پرواز اتنی نہیں کہ مقامِ نظر کی بلندی تک پہنچ سکے۔

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست

اربابِ معنی کے دل میں فلسفہ و حکمت کی قیل و قال بھی کیف و حال پیدا کرتی ہے۔

مگر بہ رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد
دل از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آید

عقل اگر اپنی صحیح فطرت سے منحرف یعنی ذوقِ نظر سے خالی ہو تو جو علم اس کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ہم مظاہر میں الجھ کر حقیقت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اگر عقل اپنی منزلِ مقصود سے واقف ہے تو وہ علمِ ظاہر کے ذریعے سے علمِ باطن کی راہ ہموار کر دیتی ہے اور اس حد تک ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ہمارے دل میں معرفتِ حقیقت کی آرزو کو بیدار کر دے۔ یہی اس کی منتہائے پرواز ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ ہمیں چھوڑ دیتی ہے کہ ہم عشق کے سہارے آگے بڑھتے چلے جائیں:-

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است
پیشِ چشمِ ما حجابِ اکبر است

علم را مقصود اگر باشد نظر
می شود ہم جادہ و ہم راہبر

می نہد پیشِ تو از قشرِ وجود
تا تو پرسی چیست را زِ ایں نمود

جادہ را ہموار سازد ایں چنیں
شوق را بیدار سازد ایں چنیں

علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو   دیدہ و دل پرورش گیرد از و
بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا   باز چوں جبریل بگذارد ترا

عقل کا اس سے بھی زیادہ وسیع تصور یہ ہے کہ وہ "خبر" اور "نظر" "علم و عشق" دونوں پر حاوی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں، ایک ناسوتی دوسرا لاہوتی۔ ایک پہلو سے دیکھئے تو اس کا عمل ادراک عالم آب و گل سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں بھی سطحیات یعنی مظاہر تک محدود ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھئے تو اس کی نظر ظاہر کائنات سے گذر کر اس کی ماہیت و حقیقت میں ڈوب جاتی ہے اور عالم تحت قمر سے گذر کر عالم علوی کی سیر کرتی ہے۔ ایک طرف وہ زمان و مکان کے پردے میں مجازی کے ظنی علم سے آگے نہیں بڑھتی اور دوسری طرف ان پردوں کو اٹھا کر حقیقت کا عینی مشاہدہ کرتی ہے۔ یہی عقل کا دوسرا پہلو ... جو سوز محبت سے آشنا اور نور معرفت سے روشن ہے عشق کہلاتا ہے۔

عقل خود بین دگر و عقل جہاں بیں دگر است   بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک   آنکہ گیرد خورش از دانۂ پروین دگر است
دگر است آنکہ زند سیر چمن مثل نسیم   آنکہ در شد بہ ضمیر گل و نسریں دگر است
دگر است آں سوئے نہ پردہ کشادن نظرے   ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نور افرشتہ و سوز دل آدم با اوست

غرض اقبال کے تصور عقل و عشق کا ماحصل یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی

حقیقی فرق نہیں بلکہ صرف مدارجِ ارتقا کا فرق ہے۔ ان میں مابہ الامتیاز آرزوئے معرفت کی وہ خاص کیفیت ہے جسے شاعر نے سوز کہا ہے۔ اگر عقل میں یہ سوز پیدا ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے۔

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد

اقبالؔ

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

اقبالؔ اٹھ گئے۔ ان سے قبل ان سے بڑے لوگ بھی رحلت کر چکے ہیں، لیکن اقبالؔ ابھی ہم میں موجود تھے۔ ہم انہیں اپنی ہی طرح جیتے جاگتے کھاتے پیتے، ہنستے بولتے دیکھ چکے تھے۔ دوسروں کا صرف کارنامہ ہمارے سامنے ہے۔ کارناموں سے زیادہ ہم ان اشخاص سے متاثر ہوتے ہیں جن کو ہم اپنی ہی طرح اپنے میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ شخص کی جدائی سے شخصیت کی جدائی زیادہ شخصی ہوتی ہے، اس لئے زیادہ بیچین کرنے والی بھی ہوتی ہے۔ پھر اقبالؔ جو بحیثیت شخص اور شخصیت دونوں کے مدتوں ہم میں رہے، کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔

مجھے اس وقت اپنے بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے۔ جب صرف اچھی باتیں ہوتی تھیں، اور اچھی باتیں وہی تھیں جو اپنے آپ کو اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ اور کیسی اچھی باتیں وہ ہوتی تھیں اور کیسا اچھا زمانہ وہ تھا جب ہم کو صرف اچھے اور خوشگوار سے دلچسپی تھی۔ ان کے انجام سے ان کو مشتبہ یا مضر قرار دینے کی تکلیف دہ استعداد پیدا نہیں ہوتی تھی؛ جب زیادہ سے زیادہ اتنی سی بات ذہن میں پیدا ہو لیتی

تھی کہ اگر کوئی آفت یا برائی کا سامنا ہوگا تو ماں باپ اُسے سنبھال لیں گے۔ اقبالؔ کی نظمیں پڑھ کر دل میں عجیب عجیب امنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ سمجھ میں کم آتی تھیں، لیکن وہ باتیں جو کرداروں کی زبان یا وسیلہ سے کہتے تھے وہ بڑی دل آویز معلوم ہوتی تھیں۔ ان سے ہماری دوستی ہوجاتی۔ مجھے یاد آتا ہے! اقبالؔ کی مشہور اردو نظم "خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا" بزرگوں کی اک صحبت میں پڑھی جارہی تھی۔ ساری باتیں تو سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ قمر کے معنی معلوم تھے، کلی، چمن اور بہار سے واقفیت تھی۔ چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا، یاد ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چمن و بہار کا جب کبھی تذکرہ ہوتا یا ان کا تصوّر آتا تو میرا دل اُمنڈ آتا۔ مجھے کبھی کبھی اقبالؔ پر غصہ آتا اور کبھی ان سے شدید ہمدردی ہوتی کہ انھوں نے چمن و بہار کو کیوں تکلیف پہنچائی یا تکلیف پہنچنے دی۔ اس کے بعد یہ خیال آتا کہ اقبالؔ نے چمن و بہار کو بچانے کی کوشش کی ہوگی، لیکن کامیاب نہ ہوئے ہوں گے۔ خدا نے ایسی بات کیوں کہی، خدا کیسا ہے کہ خوشی کی باتیں نہیں کرتا یا نہیں ہونے دیتا۔ خدا ہم بچوں کی مانند نہیں ہے، بلکہ ہمارے بزرگوں کی مانند ہے، جو ہنستے ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور خفا ہوتے ہیں تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے خدا بچہ ہوتا تو کلی، بہار اور چمن کے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہ ہوتا۔

زمانہ گزرتا گیا لیکن اقبالؔ کا خیال دل سے نہ گیا۔ ان کے کلام کا منتظر رہتا، پڑھنا آگیا تھا اس لئے جہاں کہیں ان کی نظمیں ملتیں ان کا مطالعہ ضرور کرتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے مدتوں اس امر کا التزام

رکھا کہ اقبال کی جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ کسی سے پوچھی نہ جائے۔ محض اس خیال سے کہ میں نے جن بنیادوں پر اپنی جنت تعمیر کی ہے کوئی دوسرا اسے مسمار نہ کر دے۔ الفاظ اور فقرے سمجھ میں آتے تھے۔ اصلی مفہوم کی دنیا بناتا، اور اس میں خوب گھوم پھر کر اور لطف اٹھا کے باہر نکل آتا۔ اسی زمانہ میں ایک مولوی صاحب ماقیماں اور محمود نامہ پڑھاتے تھے، فارسی کا وہ صرف تحت لفظ ترجمہ کراتے جس کا مجھ پر بالکل اثر نہ ہوتا، لیکن براہ راست فارسی سے میں ایک معنی خود وضع کرتا اور ہمیشہ اس معنی کی ایک دنیا، ایک تصویر خانہ بناتا اور اس میں گھوم پھر کر خوش ہوتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ فارسی کا وہ کلام تو کسی اور کا ہوتا۔ لیکن اس کے مفہوم کی جو دنیا میں بناتا اس کے بارے میں یقین ہوتا کہ یہ اقبال کی بنائی ہوئی دنیا ہے اس لئے یہ دنیا ٹھیک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ یہ بچپن کی باتیں ہیں اب تیس بتیس سال بعد اس پر نظر ڈالتا ہوں تو ہنسی سی آتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایسی ہی باتیں ہر بچے کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، نئی بات دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ پرانی باتیں صرف نئے ذہنوں اور نئے سانچوں میں مختلف پہلوؤں سے چرخ کھا کر نئے اسلوب اختیار کر لیتی ہیں، اور اسالیب ان گنت ہیں، جو نہ ہوں تو دنیا فرسودہ ہو کر مٹ جائے۔

مرنے والے مرتے ہی ہیں، ان میں اپنے بھی ہوتے ہیں پرائے بھی۔ رنج و ماتم بھی کیا جاتا ہے۔ آخر اقبال کے لئے ہم رہ رہ کر کیوں غمناک ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے رشتہ دار بھی ہیں دوست بھی ہیں،

اور معتقد بھی۔ رشتہ داروں کو یہ الم کہ ان کا عزیز بچھڑ گیا، ان کا سرپرست اور ان پر جان چھڑکنے والا باقی نہ رہا، جس کی صحبت میں وہ زندگی کا لطف اٹھاتے تھے، جس کی ہمدردی، قابلیت، زندہ دلی اور رفاقت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ آخر وہ لوگ کیوں حیران وحزیں ہیں، جن کو اقبال سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا؟ ممکن ہے ایسوں کا کوئی خاص رشتہ ہو، اس رشتہ کے ٹوٹنے کا غم ہو۔ یہ رشتہ بہت سے دوسرے رشتوں سے زیادہ پائدار ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق ذہنی و روحانی صداقتوں سے ہوتا ہے جس کو زوال نہیں، جن پر کسی کو قدرت نہیں جن کو مٹانا یوں ناممکن ہے کہ ان کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا، ان کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ نسلیں بیت جائیں گی، زندگی کچھ کی کچھ ہو جائے گی، لیکن یہ تعلق قائم رہے گا۔ غم کی جگہ عظمت لے لے گی۔ اور یہی عظمت دوسری عظمتوں کا زینہ بنے گی۔ ترقی اسی کا نام ہے۔

موت کسی کا احترام نہیں کرتی، اس سے سب ڈرتے ہیں سوا زندگی کے جو اپنے آپ کو موت سے زیادہ پائدار اور بامعنی سمجھتی ہے، اس لئے کہ خدا زندہ ہے۔ اس کی مشیّت زندہ ہے اور زندگی اس کی سب سے بڑی اور سب سے بلند حقیقت ہے۔ اقبال نے اس زندگی کو حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ وہ اس حقیقت کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں، طرح طرح سے ذہن نشین کراتے ہیں، وہ اپنی اس تعلیم میں زندہ ہیں۔

میں نے کتابیں پڑھی ہیں، باتیں سُنی ہیں، صحبتیں اٹھائی ہیں، زندگی

دیکھی ہے، غور و فکر کیا ہے۔ ان سب کا مجموعی اثر جو کچھ ہو سکتا ہے، جسے میں تجربہ کے وسیع مفہوم سے تعبیر کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ مسلمان کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ مسخر و مرعوب نہیں ہوتا۔ علم و فضل ہو، دولت و حشمت ہو، جان سوزی و جاں بازی ہو، وہ سمجھتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان وہ ان سب پر قادر رہا ہے اور رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اور اس کے نزدیک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی اس کو بشارت نہ دی گئی ہو اور کوئی بشارت ایسی نہیں ہے جو اس پر پوری نہ کی گئی ہو۔

اس حقیقت کا احساس افراد کو سنبھالنے اور جماعت کو منظم اور پائندہ کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اقبال ہم میں اس وقت آئے جب ہم اپنی زبونی کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے، ہم کو اپنی باتیں، اپنے اسلاف، اپنی روایات اپنی استعداد، اپنی تہذیب و تمدن، اپنا علم و کمال، اپنا مذہب و اخلاق غرض اپنا سب کچھ پست و ہیچ نظر آتا ہے، ہم ان سے شرماتے تھے، ہم میں سے اکثر ان کا مضحکہ اڑانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ لوگوں میں بیٹھ کر ہم اپنے علم و کمال، اپنے تمدن، اپنے شعر و ادب کی آڑ پکڑنے سے شرماتے تھے۔ اقبال نے اس طلسم ہیچمیداری کو توڑ دیا۔

اقبال نے زیادہ تر وہی باتیں کہی ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں، ائمہ کے اقوال میں ہیں، بزرگوں کے کارناموں میں ہیں۔ اب بھی ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں یا سنیں کہ قرآن میں یہ آیا ہے، رسولؐ کا یہ ارشاد ہے، بزرگوں نے یہ فرمایا ہے تو ہم پر اس کا اثر نہیں ہوتا، لیکن بالکل انہیں باتوں کو

جب اقبال اپنی زبان سے اپنے اشعار ہیں بیان کرتے ہیں تو ہم وجد میں آجاتے ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں، اس کی تبلیغ کرتے ہیں، اس کی آڑ پکڑتے ہیں اور اس پر اڑ جاتے ہیں۔ یہ آخر کیوں؟ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے ذہن و دماغ کے گوشے اور زاویئے ہیں بعض چھپے ہوئے تار، جب کوئی پہنچا ہوا ان کو پہچان کر چھیڑ دیتا ہے تو پھر زندگی و عمل کے نغمے بیدار ہو جاتے ہیں اور بند، اٹے ہوئے سوتے کھل جاتے ہیں اور ہم فوراً محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں اور بہت کچھ کر سکتے ہیں!

دور کیوں جایئے، اپنی شعر و شاعری ہی کو لے لیجئے، اردو شعر و شاعری کو آج سے پہلے ہم کیا سمجھتے تھے۔ ہمارے نزدیک اس کی کیا حیثیت تھی؟ محض تفریحی۔ ہم لطف زبان و بیان سے مسرور ہو لیتے تھے۔ کبھی کبھی تصوف یا عشق کی باتوں یا گھاتوں کو سُن کر یا پاکر جی بہلا لیا کرتے تھے۔ اقبال نے اُردو ہی کو وسیلۂ کار بنایا، لیکن اپنے خلوص، اپنے اسرار، اپنے تجربات، اپنی ژرف نگاہی اور اپنے بصائر سے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا! اب ہم صرف الفاظ کی صنعت گری پر خوش نہیں ہو لیتے بلکہ اس طرح متاثر و متحرک ہوتے ہیں جیسے کوئی بھولی ہوئی بات اچانک یاد آجائے، سوتی ہوئی استعداد بیدار ہو جائے اور بیدار شدہ استعداد عمل کا جامہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اقبال کی شاعری نے اردو شعر و شاعری کے مقررہ معیار کو زیر و زبر کر کے ایک دوسرا نہایت وقیع معیار وضع کر دیا ہے۔ انہوں نے اردو کے لئے ایسا سکہ رائج کر دیا ہے جس کے لئے ہم کو نئی نئی متاع اور نئے نئے بازار فراہم کرنے پڑیں گے۔ ایسا کرنے کا ولولہ ہم میں پیدا بھی ہو چکا ہے!

آج ہم ہی نہیں ساری دُنیا یورپ کے کمالات ذہنی وعملی پر ایمان لاچکی ہے، اور کیوں نہ ایمان لائے، یورپ نے زندگی کو ایک مستقل معیار سے دیکھا، جانا اور پہچانا، اس لئے زندگی کو لڑ کر فتح کیا، اسے دیکھ کر نہ تو اس نے افسوس کیا اور نہ پیچھے ہٹا۔ اس نے زندگی کے راز دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس سے نپٹنے کی جد وجہد کی۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس نے دنیا کے صرف ان پہلوؤں کو پرکھا جو قوانین فطرت کے ماتحت تھے، ان کو نہیں جو مافوق الفطرت قوتوں کے زیر نگیں تھے، وہ فطرت کے قوانین سے واقف ہوا لیکن اس کے "اسکرپچر" Scripture (صحیفۂ الہام) سے بے بہرہ رہا۔ اس نے جن وسائل میں عوامل فطرت کو سر کیا تھا، انھیں وسائل کی مدد سے فضائل انسانی کو نہ حاصل کر سکا اور نہ ان کی اہمیت کا قائل ہوا۔ یورپ کی اس تسخیر کو ہم نے ہمہ گیر سمجھ لیا، اور اس کی کوتاہی نا قابل التفات۔ یورپ وسائل کا موجد بھی تسلیم کیا گیا اور مختار مطلق بھی۔ اس نے جن وسائل سے فطرت کو تسخیر کیا تھا ہم نے انھیں کو سب کچھ سمجھ لیا اور جو کچھ اس نے مسخر کیا انھیں کو تسخیر کئے جانے کے قابل سمجھا، یہی نہیں بلکہ یورپ کے ساتھ ہم نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ دوسری نوعیت کے نہ تو وسائل ہو سکتے تھے اور نہ دوسری چیزیں مسخر کئے جانے کے قابل تھیں۔

اقبال جو کچھ کہتے تھے راز داں کی حیثیت سے کہتے تھے۔ ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو سنگسار کر دیتے تھے۔ لیکن اقبال کے کہے کو کس طرح ٹال سکتے تھے جو ہم سے

زیادہ یورپ کو پرکھ چکے تھے۔ اقبال نے یورپ ہی کے حربہ سے یورپ کا جواب دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے اس بھولے ہوئے سبق کو پھر دُہرا دیا کہ انسان کے فرائض تسخیر فطرت ہی تک ختم نہیں ہو جاتے بلکہ انسانی زندگی کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ وہ آفرینش کی تسخیر پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دُنیا اور آخرت کو ایک با معنی سلسلہ میں ربط دینے پر اصرار کیا۔ وہ حکومت ارضی کو نیابت آلہٰی سے کمتر درجہ کی چیز سمجھتے تھے۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ زندگی کے عروج اور انسانی استعداد کو برگزیدہ بنانے اور رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک برگزیدہ تر مقصد پیش نظر ہو، آخرت کا تصور اسی مقصد کی ترجمانی کرتا ہے۔ آخرت نام ہے اس تصور کا جو انسانی کارکردگی اور انسانی فضائل کو متوازن بھی رکھتا ہے اور رمائل بہ صعود بھی۔ اقبال اسی تصور کے مفسر و مبلغ تھے اور اسی تصور سے انھوں نے مغرب کے مقابلہ میں مشرق کو سربلند ہونے کی دعوت دی۔ ہم اس پر ایمان لا رہے ہیں۔

اقبال شاعر ہی نہ تھے بلکہ بہت کچھ اور بھی۔ لیکن یہ بات ان لوگوں کو کیسے بتائی و سمجھائی جائے جنھوں نے اقبال کو کتاب میں پڑھا ہو اور زندگی میں نہ دیکھا ہو۔ میں تو اقبال کے ظرف کا قائل ہوں کہ وہ کتنی بات جانتے پہچانتے تھے، لیکن جس جگہ جس طور پر جم کر بیٹھ گئے تھے وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ کسی قدر گستاخ ہو کر ۱۹۲۵ء میں ان سے کہدیا تھا "ڈاکٹر صاحب آپ نے دنیا کو دھوکا دے رکھا ہے۔ اس فریب کو دنیا نے کبھی پالیا تو کیا ہوگا،"

یہ سُن کر متحیر ہو گئے لیکن مسکرا کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے"؟ میں نے عرض کیا "ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت اور بڑے غور و فکر کے بعد اپنے خیالات اپنے اشعار میں قلمبند کر دیئے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ جانتے پہچانتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی آپ کے کلام میں نہیں ہے۔ یہ تو بڑا ستم ہے کہ ہم صرف اتنا ہی جان کر اکتفا کر لیں اور آپ یہ غضب کر رہے ہیں کہ شعر و شاعری سے آگے نہیں بڑھتے۔ آپ کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی آپ کے اشعار میں محض کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سی مل جاتی ہے، حالانکہ آپ بات بات میں وہ نکتے بتا جاتے ہیں جو مدتوں مطالعہ کے بعد بھی شاید نہ معلوم ہوتے"۔ ڈاکٹر صاحب بڑے زور سے ہنسے، سر کرسی کے تکیہ پر ڈال دیا چھت کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر حقے کا ایک گہرا کش لے کر بولے، "دیکھو دنیا جس آفت میں مبتلا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ پورے طور پر بتا نہیں سکتے اور جو لوگ نہیں جانتے وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں اور بتاتے بھی رہتے ہیں"! اس کے بعد ایک عجیب انداز سے مسکرائے، کہنے لگے "تو پھر کیا چاہتے ہو"! اس کے بعد پھر ایسی بات بتائی جس کے بتانے کا یہ موقع نہیں۔

ایڈیٹر صاحب "جوہر"!

آپ کا اصرار تھا کہ میں آپ کے "جوہر" کے لئے اقبال پر کچھ لکھوں۔ مجھے یاد آتا ہے میں نے آپ سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن آپ نہیں جانتے ہم علی گڈھ والے دفع الوقتی کے کیسے استاد ہیں۔ آپ —

کے تقاضوں سے بدحواس تو ہو گیا، لیکن بدحواسی میں بھی یہ نہ بھولا کہ دفع الوقتی کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ اس مضمون میں اس قسم کی مثالیں آپ کو بہت سی ملیں گی، یہ مضمون لکھ ہی رہا تھا کہ ایک جلسہ میں شرکت کرنے پٹنہ جانا پڑا۔ اب جو وہاں سے واپس آیا ہوں تو آپ کے لئے جہاں تک لکھ چکا تھا وہیں ختم کرتا ہوں۔ اقبال پر لکھنے سے اکتا نہیں سکتا جب تک زندگی سے نہ اکتا جاؤں، اور آپ تو جانتے ہیں مسلمان زندگی سے کبھی نہیں اکتاتا، بالخصوص ایسی حالت میں جب لکھنا پڑھنا میرا پیشہ ہو اور فرمائش کرنے والے وہ لوگ ہوں جو مُرشد ذواکر صاحب کے دست و بازو ہوں۔ ہاں مرشد کا تذکرہ آگیا تو ایک شعر بھی سُن لیجئے جس کا مرشد نے ایک طویل خط میں حوالہ دیا تھا۔ یہ خط ایک نہایت اہم مسئلہ پر ایک موقر مجلس کے عہدہ دار کے نام تھا، اور جسے مرشد نے ایسی حالت میں لکھا تھا جب وہ آنکھ کی تکلیف سے بے بس ہو کر بمبئی آئے ہوئے تھے۔ آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے۔ عنقریب آپریشن ہونے والا تھا اور اس مسئلہ کو مجمع کے سامنے صحیح طور پر پیش کرنے والا کوئی نہ تھا جس کی اہمیت دوست دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

اقبال کے اس شعر سے اقبال کی شخصیت اور ان کے پیام کی اہمیت کا اندازہ کیجئے!!

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر اقبال

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن

ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملاقات کا شرف مجھے مارچ ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں میں پریس کا کاروبار کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم پیام مشرق کا نیا ایڈیشن چھپوانا چاہتے تھے اور ایک دوست سید نذیر نیازی صاحب نے میرا تعارف اور میرے پریس کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے موقع کو غنیمت جانا اور لاہور چلا گیا اس وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مکان میکلیوڈ روڈ پر تھا۔ ویسے تو مکان کا پھاٹک بھی تھا اور اپنی الگ سڑک بھی تھی، لیکن پھاٹک چند ٹوٹی پھوٹی کوٹھریوں کی بغل میں تھا اور اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر نہ زمین کی سیاہی باقی رہی تھی نہ حرفوں کی سفیدی، بس زنگ اور گرد کے بڑے بڑے دھبے سے تھے، اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سوا اور کسی کو ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسے بورڈ کو اپنے پھاٹک پر ٹنگا رہنے دے۔ پھاٹک کے اندر احاطہ خاصا بڑا تھا، لیکن وہاں پہنچنے پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دیدار کے خیال نے نظر کو اِدھر اُدھر دوڑنے نہ دیا، میرے دوست نے ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش کو پکارا، وہ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا، مگر آواز کا جواب خود ڈاکٹر صاحب نے دیا۔

"آؤ جی نیازی صاحب"

ہم دونوں جلدی سے زینوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے، میرا تعارف

کرایا گیا اور میں ادب سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تازی چلم بھروائی اور بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ حسن و عشق کے ذکر کا نہیں تو ردیف اور قافیہ اور بحر کے ترنم کا اثر شاعر کی صورت پر پڑتا ہے اور صورت میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو تو ادا، انداز، آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی لرزش، کوئی نہ کوئی خصوصیت نظم کہنے والے کو ان لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے جو نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی وجہ سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال کی صورت شکل، وضع قطع، لباس اور گفتگو میں ان کی شاعرانہ عظمت کا پتہ دینے والی کوئی صفت نہیں۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا اور پہلی نظر نے اسے اور بڑھا بھی دیا۔ نیلی قمیص، شلوار، نہ میلی نہ صاف، بال مٹیالے بھورے رنگ کے، جنھیں حجام نے جیسے سمجھ میں آیا کاٹ دیا تھا، رنگت بے آب، آنکھیں دھوپ میں بیٹھے رہنے سے دبی اور ڈھلتی ہوئی، مونچھیں پتلی اور آگے کو نکلی ہوئی، دہانہ چوڑا اور اس کے دونوں طرف گہری جھریاں، اس پر زبان ملی جلی اردو اور پنجابی۔ یہ شاعر کا سراپا نہ کہلائے گا اور دراصل یہ ڈاکٹر صاحب کی اصل صورت تھی بھی نہیں، بلکہ شلوار اور قمیص کی طرح روزمرہ کی صورت جو ایک پردے کی طرح اوپر پڑی رہتی تھی، اور ان کی اصل صورت کو روزمرہ کے گرد و غبار اور اس میل سے بچاتی تھی جو سبھی کے جسم پر جما کرتا ہے۔ یہ اوپر کا پردہ ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد ہی اٹھ گیا، جب ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع کی۔ وہ تخیل اور ہمت کی اس پستی سے بیزار تھے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو صنعت اور کاروبار، سائنس اور تجارت کے

میدانوں میں قدم رکھنے سے روکتی ہے اور انہیں تاریخ اور ادب کی کتابیں چاٹنے کے سوا اور کسی لائق نہیں چھوڑتی۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی کہ میں نے جرمنی جاکر پریس کا کام سیکھا تھا اور ان کی ہمت افزائی نے مجھے بھی اس کا موقع دیا کہ میرے دل میں ان کی جو عزت اور محبت تھی اُسے ظاہر کردوں۔ پھر اگلے وقتوں کی باتیں چھڑیں، مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہیں، تاریخ ان کے مکان کی چھت ہے، اور وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ دیواریں کہیں اتنی کمزور نہ ہو جائیں کہ چھت کا بوجھ نہ سنبھال سکیں کہیں ان کے سر سے سایہ نہ اٹھ جائے، ان کا گھر ویران نہ ہو جائے۔ اگلے وقتوں کی باتیں چھڑیں تو ڈاکٹر صاحب کی صورت سے دوسرا پردہ ہٹا۔

ظاہر میں تو وہی ڈاکٹر اقبال اسی لباس میں اُسی کرسی پر دھوپ میں بیٹھے حقے کے کش پر کش لے رہے تھے لیکن ان کی باتیں سنتے سنتے کبھی تو اس کتب خانہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جہاں علم کا سارا ذخیرہ جمع ہو، جہاں عالم اور شاعر اور فقیہ مل کر بیٹھتے ہوں، ان کے دل میں ایک خیال، زبان پر ایک بات، آنکھ میں ایک نشہ ہو، اور ان کی صحبت نے ایک فضا پیدا کردی ہو جو آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جائے، اور اس کے دل میں وہی ایک خیال سما جائے، زبان سے وہی ایک بات نکلے، آنکھ اسی ایک نشہ میں مست ہو جائے کہ جس نے عالم اور شاعر اور فقیہ کی تین ہستیوں کو ایک شخصیت بنا دیا تھا، کبھی نظر ہر قید سے آزاد ہو جاتی تھی، مشرق سے مغرب تک دنیا ایک قالین کی طرح بچھ جاتی تھی اور دنیا کا وہ کاروبار جو تخیل کو عاجز کر دیتا ہے آنکھ سے دکھائی دینے

لگتا، کبھی جہالت کی تاریکی علم کی روشنی سے چھنٹتی، مشکل کی گرہ شوق کے ہاتھوں کھلتی۔ کبھی علم اور شوق کی پیاس جذبۂ دین کے اُبلتے چشموں میں بجھتی کبھی منزل کی دوری ہمت کو ڈراتی، کبھی منزل پر پہنچ کر انسان زمین آسمان پر اس طرح نظر ڈالتا ہوا دکھائی دیتا جیسے کسان اپنی زمین کو دیکھتا ہے۔ اس وقت بھی ڈاکٹر اقبال اسی لہجہ میں، اسی انداز سے باتیں کر رہے تھے لیکن میرا سر جھکتا جا رہا تھا، آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

یہ دوسرا پردہ نہیں ہٹا، اس کے آگے میں اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے آگے اور کوئی بھی جا نہیں سکتا تھا، کیونکہ وہاں ڈاکٹر اقبال کی خلوت تھی، جس کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ آسمان کی طرف کھلتا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں دو تین روز کے اندر کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے یہاں صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دو ایک بار میں ایسے وقت بھی گیا جب وہاں اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور اُن سے ڈاکٹر اقبال کی جو گفتگو ہوتی تھی وہ بھی میں نے سُنی پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شخصیت کو تہ در تہ کیوں رکھتے ہیں، لاہور کے شہری بن کر کیوں رہتے ہیں، ملّت اسلامی کا آفتاب ہوتے ہوئے بادلوں کے نقاب کیوں ڈالے رہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے پروائی جو شاعرانہ مزاج کے لوگ بکھرے بالوں اور بے ڈھنگے کپڑوں سے ظاہر کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس طرح سے برتی کہ اپنے آپ کو ہر امتیاز سے محروم کر دیا۔ وہ خوش مذاقی جو دوسرے اچھے کپڑوں، سلیقے کے رہن سہن، نفاست اور تکلفات میں تلاش کرتے ہیں، انھیں ملنساری، ہنسی مذاق

اور دریائی پرند کی طرح پانی میں رہ کر پر پرواز کو خشک رکھنے کی صفت میں ملی۔ انھوں نے اس ادنیٰ وضعداری کو نظر انداز کیا جس کی رسائی لباس اور آداب صحبت کے آگے نہیں، اور اس اعلیٰ وضعداری کو اختیار کیا جو منجدھار میں چٹان کو قائم رکھتی ہے یا زمین آسمان کی گردش میں قطب کے ستارے کو۔ وہ دنیا میں دنیا والوں کی طرح رہتے تھے۔ دل میں صاحب دلوں کی طرح، گفتگو جلوت میں کرتے تھے، شعر خلوت میں کہتے تھے۔ وہ خود بالکل سچ فرما گئے ہیں کہ ؎

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

جنوں کے اس زور میں بھی میرا گریبان کبھی چاک نہ ہوا یہ ہر دیوانے کے بس کی بات نہیں کہ جنوں میں بھی آپے سے باہر نہ ہو۔

ان کی ظاہری صورت دراصل ضبط کا ایک پردہ تھا، اور اس میں خوبی یہ تھی کہ پردہ قدرتی تھا جیسے ہیرے کے لئے پہاڑ کا آنچل، موتی کے لئے سیپ کا سینہ ہوا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر مجھے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے دل میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کی بڑی قدر تھی یہ شکایت کرتے تھے کہ ان سے مل کر وہ اس طرح محظوظ نہ ہوئے جیسا کہ ان کا کلام سنکر محظوظ ہوتے تھے ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں بیٹھ کر ہر شخص ان کا جلوہ دیکھ سکتا تو ڈاکٹر اقبال نہ رہتے یا ان کا جلوہ نہ رہتا (ان کی صحبت دراصل صحبت میں بیٹھنے والے کا امتحان تھا۔ وہاں جا کر دوسرے یہ اندازہ نہ کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال کتنے بڑے آدمی ہیں، ڈاکٹر اقبال خود یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ ملنے والا کس ذہنیت اور کس مذاق کا آدمی ہے، اور اسی کے لحاظ سے گفتگو ہوتی۔

ڈاکٹر اقبال کے اپنے ذہن میں بڑی لوچ تھی، وہ نہ عقاب کی طرح بلندی کے پابند تھے، نہ چوپایوں اور آدمی کی طرح پستی میں گرفتار۔ سچے شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اپنی نظموں میں اپنے متعلق جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے۔ اب یہ ان کے قدردانوں کا فرض تھا کہ ان کی شخصیت کو سمجھیں، اس سے اثر لیں، اور روزمرہ زندگی میں انھیں باتوں کے چرچے کریں جو ڈاکٹر اقبال کے دل اور ان کے کلام میں رہتے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا...... اور اس کا دکھ سب سے زیادہ خود ڈاکٹر صاحب کو تھا۔ ان کی مایوسی کا جو عالم تھا وہ ان کی ان تمثیلی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنی بے قدری اور تنہائی کی کیفیت بیان کی ہے اور اسی کی پرچھائیں سی میں ایک مرتبہ ان کے چہرے پر دیکھ بھی چکا ہوں۔ لوگوں نے انھیں سیاست میں الجھایا، ان کی بات نہیں سمجھے، ان کی زبان سے اپنی بات کہلوانے کی فکر میں لگے رہے، ان کی بڑی غرض کو اپنی حقیر اغراض کا روپ دے کر اسے رسوا کیا۔ ان کے بڑے کام کے بہانے سے اپنا چھوٹا کام نکال کر انھیں اور ساری دنیا کو دھوکا دیا۔ جنھوں نے یہ نہیں کیا وہ بھی عمل کا کام کر کے دکھانے کا، تحریکیں اٹھانے کا شور مچاتے رہے۔ ڈاکٹر اقبال سے مطالبہ کرتے رہے کہ اپنی آنکھیں بند اور دل خاموش کر کے ان میں آکر مل جائیں، اجالے سے فائدہ نہ اٹھایا، آفتاب کو اپنے پاس بلاتے رہے۔ ڈاکٹر اقبال کا بڑا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے، ان کا دل اپنا بڑا کام کر بھی گیا جس شخصیت کا وہ خواب دیکھتے تھے اس کے اور ان کے درمیان بس موقع کا فرق تھا،

جس عمل کو وہ سچا عمل سمجھتے تھے، وہ غور کیجئے تو ان کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رُخ ہے۔ انھوں نے اپنے اندر وہ یقین پیدا کر لیا تھا جو دنیا میں ایماں پھیلاتا ہے اور زندگی کا سارا بوجھ سنبھالتا ہے، اور ان کے ذہن میں انسانیت کا جو تصور تھا وہ وہی ہے جس نے دنیا کو بار ہا ایک نئی دنیا بنا دیا ہے، اور ان کے کلام میں ایک نئی دُنیا بنی بنائی ملتی بھی ہے۔ انھوں نے بہتیرے بھید بُوجھ لئے تھے جو یقین کی جان اور انسانیت کی آبرو ہیں، اور ان میں وہ صفت پائی جاتی تھی جو سچے یقین سچی انسانیت، سچے علم کی پہچان ہے، یعنی ایک پوری ملت کے تمام گہرے اور مستقل اور زندگی کو شکل وصورت دینے والے جذبات سمٹ کر ان کے دل میں آگئے تھے اور اسے ایک ایسا نمونہ بنا دیا تھا کہ جسے دیکھ کر تاریخ کہتی ہے کہ ہاں صحیح ہے، مذہب کہتا ہے کہ ہاں یہی چاہئے، اور ہر زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم بھی ایسے ہو جائیں۔ چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو، ہر دلعزیزی کا بادباں ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے، سستانے اور پناہ لینے کے لئے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب رہے، تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں۔ وہ موج تو چیز ہی اور ہوتی ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا، آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اور اونچا ہو سکتا ہو تو ہو جا۔ اسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے، وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے، اسے کہیں جانا نہیں ہوتا، اس کے لئے اُٹھنا اور تڑپنا

بس ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اس کا سمندر عالمِ اسلام تھا۔ میں اس سمندر کا ایک گمنام قطرہ بھلا کیا بتا سکتا ہوں کہ موج اٹھی اور اس نے سمندر کو تہ تک ہلا دیا، تڑپ کر آسمان کا منھ چوما اور پھر بیٹھ کر سمندر بن گئی، تو اس میں موج اور موج کو پیدا کرنے والے کی کیا مصلحت تھی، وہ کچھ اور کیوں نہ تھی، اس نے کچھ اور کیوں نہ کیا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ موج نہ ہوتی تو کوئی نہ تھا جو مجھے اپنے پہلو میں لیتا اور اتنا اونچا اٹھا دیتا کہ سمندر کو دیکھوں، سمندر کے پھیلاؤ کو دیکھوں، دونوں جہان پر ایک نظر ڈالوں اور تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لوں کہ قطرے کی بھی کچھ ہستی ہوتی ہے۔

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

حیات اقبال کا سبق

مولٰنا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

دنیا کا میلان ابتدا سے جدید ترین دور تک "اکابر پرستی (Hero Worship) کی جانب رہا ہے۔ ہر بڑی چیز کو دیکھ کر ھذا ربی ھذا اکبر کہنے کی عادت جس کا ظہور قدیم ترین انسان سے ہوا تھا، آج تک اس سے نہیں چھوٹی ہے۔ جس طرح دو ہزار برس پہلے بودھ کی عظمت کا اعتراف اس مخلوق کے نزدیک بجز اس کے اور کسی صورت سے نہ ہو سکتا تھا کہ اس کا مجسمہ بنا کر اس کی عبادت کی جائے، اسی طرح آج بیسویں صدی میں دنیا کی سب سے زیادہ سخت منکر عبودیت قوم (روس) کا ذہن لنین کی بزرگی کے اعتراف کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ اس کی شخصیت کے آگے مراسم عبودیت بجالائے۔

لیکن مسلمانوں کا نقطۂ نظر اس باب میں عام انسانوں سے مختلف ہے۔ اکابر پرستی کا تصور اس کے ذہن کی افتاد سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ وہ بڑوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کی صرف ایک ہی صورت سوچ سکتا ہے یعنی اولئک الذین ھدٰاھم اللہ فبھدٰھم اقتدہ "اللہ نے ان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتایا تھا جس پر چل کر وہ بزرگی کے مراتب تک پہنچے، لہٰذا ان کی زندگی سے سبق حاصل کرو اور اس کے مطابق عمل کرو"۔

اسی نقطۂ نظر سے میں اس مختصر سے مضمون میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جس اقبالؔ کی عظمت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، اس کی زندگی کیا سبق دیتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اقبالؔ نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں، یہی تاریخ، یہی ادب یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ انھوں نے بھی پڑھا تھا۔ اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفہ تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں، یہ مرحوم اس کے سمندر پئے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ۹۹ فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں، بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اُتر چکا تھا؛ اور ان سب مرحلوں سے گذرا تھا، جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان اپنے اصولِ تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اُترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے، اور قرآن سے الگ اس

کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شئے واحد تھے، اور اس شئے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمار دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبال نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا، اور سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے، وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے، اور یہ جس کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے اور ان کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماریاں کھلوائیں گے اور بڑی بڑی کتابیں نکلوا کر ان مسائل کا حل تلاش کریں گے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لائبریری کی الماریاں مقفل کی مقفل رہیں، اور وہ صرف قرآن ہاتھ میں لے کر جواب لکھوانے بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انھوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے

ہیں، اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا، اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گذر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہ احد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں اُحد لرزنے لگا اور حضور نے فرمایا ٹھہر جا تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہوگیا" اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آکر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اُٹھتے ہیں، مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اُٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے۔ اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا، بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ اس کی معمولی مثال سُن لیجئے۔ ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ

نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور خود لارڈ ولنگڈن سے کہا کہ "میں بیشک ایک گناہ گار آدمی ہوں، احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں، مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کے حکم کو توڑ دوں"۔

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی اُفتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے، ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے جن کی بنا پر اپنی رندی کے اشتہار دیئے ہیں انھیں کچھ مزا آتا تھا۔ ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت سے ان کا خاص شغف تھا، اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، مگر آخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے، ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سر صاحبان" ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی ہوں گے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا

جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے ۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجئے جس سے اس نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے ۔ پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا ۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسولؐ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بوریئے پر سو سو کر زندگی گذاری تھی ۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا ، اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا ۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانہ میں بچھوائی ، اور جب تک وہاں مقیم رہے ، غسل خانے ہی میں سوتے رہے ۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے ؟ وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھا جو سیاسی اغراض کے لئے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں ۔ اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے ۔

اقبال کے نائٹ ہڈ اور سر شفیع مرحوم جیسے حضرات کے ساتھ ان کے سیاسی رشتہ کو دیکھ کر عام خیال یہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ محض شاعری ہی

میں آزاد خیال تھے، عملی زندگی میں آزاد خیالی ان کو چھو کر بھی نہ گذری تھی، بلکہ وہ نرے انگریز کے غلام تھے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے قریب جو لوگ رہے ہیں اور جن کو گہرے ربط وضبط کی بنا پر ان کی اندرونی زندگی اور ان کے اندرونی خیالات کا علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ انگریزی سیاست سے ان کو خیال اور عمل دونوں میں سخت نفرت تھی۔ بارگاہ حکومت سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ سرکار اور اس کے پرستار دونوں ان سے سخت بدگمان تھے اور ان کی ذات کو اپنے مقاصد میں حارج سمجھتے تھے۔ سیاسیات میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں "دارالاسلام" کو اپنا مقصود حقیقی بنائے ہوئے تھے۔ اس لئے کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارالکفر کو دوسرے دارالکفر میں تبدیل کرنے والی ہو۔ صرف یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عملی سیاسیات میں ان لوگوں کے ساتھ مجبورانہ تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیرسایہ ہندو راج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو مقاصد کے اعتبار سے اُن میں اور اس طبقہ میں کوئی ربط نہ تھا، مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اس طبقہ کے ساتھ جوڑ رکھا تھا کہ جب تک مسلمان نوجوانوں میں "دارالاسلام" کا نصب العین ایک آتش فروزاں کی طرح بھڑک نہ اٹھے اور وہ اس کے لئے سرفروشانہ جدوجہد پر آمادہ نہ ہوں، اس وقت تک کم از کم انقلاب کے رُخ کو بالکل دوسری جانب پلٹ جانے سے روکے رکھا جائے۔ اس بنا پر انھوں نے ایک طرف اپنی شاعری سے نوجوانان اسلام کے دلوں میں وہ روح پھونکنے کی کوشش کی جس سے سب لوگ واقف ہیں، اور دوسری طرف عملی سیاسات میں وہ روش اختیار

کی جس کے اصل مقصود سے چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی واقف نہیں، اور جس کے بعض ظاہری پہلوؤں کی وجہ سے وہ خود اپنے بہترین عقیدتمند معترفین تک کے طعنے سُنتے رہے۔

اقبال
شخصیت اور پیام
(پروفیسر محمد سرور صاحب)

(۱)

زندگی اپنا ظہور چاہتی ہے اور جب کوئی امر اس ظہور میں مانع ہوتا ہے تو زندگی کے پوشیدہ سوتے خشک نہیں ہو جایا کرتے اُن سے پانی رِس رِس کر جمع ہوتا رہتا ہے اور آخر کار انقلاب کی شکل میں پھوٹ نکلتا ہے، اس کا نام انقلاب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کشمکش انقلاب پر مجبور ہے۔ قوموں کا ضمیر جب زندگی کے اس شعور سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کی صحیح نمو میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں، پُرانی رسمیں دین و ایمان بن جاتی ہیں، جماعت کے قانونی شکنجے شریعت الٰہی کے نام سے افراد کے جذبۂ نمو کو ابھرنے سے روکتے ہیں، تجدید الحاد اور انقلاب کفر سمجھا جاتا ہے، دلوں میں ولولے پیدا ہوں تو اُن کا اظہار گناہ قرار پاتا ہے، دماغ جستجو کریں تو وہ گمراہی سے تعبیر ہوتی ہے۔ کبھی کوئی مردِ خدا اس جمود کو توڑنے کی کوشش کرے تو شریعت و قانون کے محافظ اس کو دار پہ لٹکاتے ہیں۔ یہ ہے کسی قوم کی موت ؎

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی

فرد مرتا ہے فنا نہیں ہوتا، بھلا قوم مر کر کیسے فنا ہو سکتی ہے، خدا تعالیٰ زندہ انسانوں کا خدا ہے۔ وہ موت میں بھی زندگی کے سامان کر دیتا ہے جب کوئی قوم زندگی کی اس منزل میں پہنچتی ہے تو فطرت زندگی کے دبے ہوئے تقاضہ کو ابھارتی ہے، موت اور زندگی میں کشمکش ہوتی ہے، زندگی حق ہے، وہ غالب آتی ہے۔ کفر باطل ہے، فنا ہو جاتا ہے۔

قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے، وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

زندگی کا یہ ذوقِ انقلاب، نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ انسانیت نیا جنم لیتی ہے اور افراد کے دل اور دماغ کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارا لعل ناب
پہ محبت کی حرارت، یہ تمنا یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

(۲)

محمد رسول اللہ کا ظہور اقدس عالم انسانیت میں ایک ایسا ہی زبردست انقلاب تھا جو پرانی دنیا کے لئے پیام موت لے کر آیا۔ پرانی دنیا کی جگہ نئی دنیا نے لی۔ انسان کا جسم قیصروں اور کسراؤں کی زنجیروں سے آزاد ہوا، اس کا ضمیر احبار اور رہبان کی خانہ ساز شریعتوں کے بندھنوں سے چھوٹا۔ نوع انسانی کی غلامی کی بیڑیاں کٹیں، زندگی کی نمود میں جو موانع تھے ختم ہوئے، انسان کی خودی نے خدائی جامہ پہنا۔ اس کا فکر و عمل آزاد ہوا، ذوقِ نمود نے عالم کائنات میں زندگی کے معجزات دکھائے، انسان

جن و ملائکہ کا مسجود تھا۔ کائنات و موجودات اس کے فرمان پذیر، آخر وہ نیابت الٰہی کے منصب سے سرفراز ہو کر خدا کی خدائی کا مالک بنا۔ اس تخیل سے انسانیت کو فروغ ہوا اور اُس کا قافلہ حیات جو صدیوں سے ایک جگہ رُکا کھڑا تھا پھر شاہ راہِ ترقی پر قدم بڑھانے لگا۔ اس انقلاب کی سعادت قیادت ملتِ اسلامی کو ملی۔

اسلام ایک عالمگیر انقلابی تحریک تھی۔ کم نظروں نے اُسے صرف مادی شکل میں دیکھا اور مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے یہ معنی سمجھے کہ اسلام کی عمر پوری ہو گئی، لیکن اسلام کے معنوی اثرات زندۂ جاوید ہیں، وہ ان معنوں میں امٹ ہے، وہ خدا کا آخری پیغام ہے اور تمام انسانیت کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس لئے کہ اسلام دعوت انقلاب کا دوسرا نام ہے اور انقلاب زندگی کا فطری تقاضہ ہے، جب تک کا وجود ہے انقلاب موجود رہے گا۔ گو انقلاب کی شکلیں بدلتی رہیں لیکن روحِ انقلاب کو زوال نہیں، وہ ابدی ہے اور اس روحِ انقلاب کا ترجمان اسلام ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز　　سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش　　ز خاکِ تیرہ دروں، تا بہ شیشۂ حلبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام　　یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

مسلمان جس پیغام کے حامل تھے اس سے روگردانی کرنے لگے، قیصر و کسریٰ کی جگہ خلفاء نے لے لی۔ علماء اور فقہا احبار اور رہبان بنے، اسلام کے نام سے ظلم و جور ہونے لگا، فکر و عمل کی آزادی گناہ ٹھہری، اور زندگی

کی نمود کو "شریعت الٰہیٰ" کی خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فطرت کی تعزیرات نے اسلامی ملت کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پہلی اُمتوں سے کیا گیا تھا۔ ترقی کے قدم رک گئے، انقلاب کا دھارا پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں تبدیل ہو گیا، اور اُس میں بساند پھیل گئی ۔

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ملت اسلامی نے اور قوموں کی طرح آئینِ نو کو بدعت سمجھا اور طرزِ کہن پر آنکھیں بند کر کے چلے جانا ثواب۔ آئین نو زندگی کا تقاضہ تھا، طرز کہن کی پشت پر سیاسی ادارے اور مذہبی جماعتیں تھیں، دونوں کی کشمکش ناگزیر تھی۔ اسلام کا خمیر انقلاب سے اُٹھا تھا، اور اس انقلاب کی روح قرآن کریم کی شکل میں زندہ تھی اس کے خلاف لاکھ قلعے تعمیر ہوا کئے لیکن ملّت کا ضمیر ان کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہ دے سکتا تھا، قرآن کی اس تعلیم سے مسلمانوں کو جو عقیدت اور شیفتگی تھی اس نے انقلاب کی روح کو زندہ رکھا اور اسلام زوال اور فنا کی تقدیر کا نشانہ بننے سے سلامت رہا۔

(۳)

ایک مبصر لکھتا ہے کہ "جب کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب بے روح قیود اور جامد قواعد کا جامہ پہن لیتا ہے، تو زندگی بخش روحانیت کو بحال کرنے کے لئے قوم میں ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے" اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں ابتدا ہی سے تجدید کی رو کا وجود نظر آتا ہے۔ جمود کے خلاف ہمیشہ ایک جذبہ کام کرتا رہا۔ جب حالات ناسازگار ہوتے تو یہ جذبہ مدھم پڑ جاتا اور سازگار ماحول میں انقلاب کی شکل

میں ملّت کے سامنے رونما ہو جاتا، اقبالؔ اسی ولولۂ انقلاب اور تحریکِ تجدید کا زبردست ترین مظہر ہے۔ ان سطروں میں اس تحریک کا پس منظر اور اس کی روشنی میں اقبال کی دعوتِ انقلاب کا ذکر ہے۔

اسلامی ملت کے ضمیر میں کم و بیش ایک صدی تک اسلام کی اصلی روحِ انقلاب جلوہ گر رہی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی میں مقناطیسی تاثیر تھی۔ وہ جدھر کا رُخ کرتے، لوگ ان کے دائرۂ اثر میں کھنچے چلے آتے، اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب لے لیتے، اپنی زبان، معاشرت اور تمدّن کو خیر باد کہہ کر ان مسلمانوں کی زبان معاشرت اور تمدن اختیار کرتے۔ اس دور کی آخری شخصیت حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کی ہے۔ اُن کی ذات ملت کے دینی قوائے حیات کا آخری لیکن نہایت شاندار نمونہ تھی۔

اس ایک صدی میں سیاسی ابتری نے جماعتی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دیا، اور افراد کا "نفس مطمئنہ" شک و انکار کا شکار ہونے لگا۔ لوگوں نے اخلاقی اور مذہبی قدروں کو تنقیدی نظر سے دیکھنا شروع کیا، جبر و قدر کی بحثیں ہونے لگیں، گناہوں کا ارتکاب ہوتا تھا، سوال یہ تھا کہ ان کی ذمہ داری بندوں پر ہے، یا بندوں کے خالق پر۔ اس کے ساتھ ساتھ اُموی، علوی، عباسی اور خارجی نزاعوں نے اخلاقی زندگی پر اثر ڈالا، دلوں سے اطمینان اُٹھ گیا اور دماغ فضول بحثوں کی اُلجھنوں میں پھنس گئے

اسلام کی دوسری صدی تداخل (Transition) کا زمانہ ہے۔ مذہبی قدروں کی حرمت باقی نہ تھی، نئی قدریں بننے نہ پائی تھیں، زندگی ایک اضطراب و ہیجان کے عالم سے گزر رہی تھی، بنی عباس کے برسرِ اقتدار

آنے سے ایرانی عنصر کو ملّی زندگی میں غلبہ نصیب ہوا۔ اس سے پرانی قدروں کی عمارت اور بھی کمزور ہو گئی۔ عرب دشمنی، الحاد و زندیقی اور اخلاقی قواعد کا استہزا معیار فیشن بنا۔ اس دور کے ترجمان بشار اور ابو نواس ہیں، جن کے اشعار فسق و فجور اور بداخلاقی اور بے دینی کا اشتہار تھے، اور لوگ ان کو نہایت شوق سے پڑھتے تھے۔

منصور اور مہدی نے بزور شمشیر اخلاق کی پرانی قیود میں رعایا کو جکڑنا چاہا، ہزاروں بے دینی اور زندیقی کے الزام میں قتل ہوئے۔ ایرانی عنصر کے زور کو توڑنے کی کوششیں ہوئیں، لیکن مذہبی زندگی کا وجدانی شعور کمزور ہو چکا تھا۔ سختی سے لوگ نیک بننے سے رہے، ایک کشمکش تھی دو قسم کے خیالات میں، ایرانی اور عرب جماعتیں ان خیالات کی ترجمان تھیں ان کی رقابت زندگی کے ہر شعبہ میں اثر انداز تھی۔ ہارون ابتدا میں ایرانی اثر میں تھا، آخر میں عربی عصبیت کا زور ہوا۔ برامکہ تباہ ہوئے ہارون کے بعد امین اور مامون کی جنگ ایرانی اور عربی جماعتوں یا یوں کہیے دو نقطۂ خیالات کی جنگ تھی۔ مامون کامیاب ہوا اور امین کی ناکامی کے ساتھ ملتِ اسلامی کی زندگی نے نیا چولا بدلا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے مذہب اور اخلاق کی پرانی قدریں بے اثر ہو رہی تھیں مامون نے ان قدروں کو نئی شکل دینے کی کوشش کی۔

مامون ملّی زندگی کی عمارت کو ایرانی اور عربی عناصر کے اتحاد اور مذہب اور فلسفہ کے امتزاج کی بنیادوں پر اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مذہب کی وجدانی روح عملی زندگی میں اپنا اثر ڈالنے سے عاجز ہے، اس کی وجہ سے قوم کا اخلاقی اساس سرے سے ختم ہو رہا ہے۔ مامون

نے کوشش کی فلسفیانہ تعلیم و تربیت سے اخلاقی اساس کو استحکام ملے۔ یونانی فلسفے کی حکومت نے حوصلہ افزائی کی۔ عقائد کا عقل و منطق سے میل ثابت کیا گیا، نیکوکاری اور اعمال صالحہ کی افادیت اور برتری ارسطو اور افلاطون کے اقوال سے لوگوں کے ذہن نشین کی گئی، لیکن وجدانی زندگی کے بغیر مذہب میں کیسے جان آسکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب خیالی موشگافیوں کا نام رہ گیا۔ عملی زندگی سے بے تعلق باتوں پر زور دیا جانے لگا۔ نہ ملت کی عملی زندگی درست ہوئی اور نہ قلبی سکون باقی رہا۔

جمہور سلف پرست تھے، ان کے دل و دماغ "اسباب و علل" کی ان الجھنوں سے دُور قرآن و حدیث کی روشنی سے اپنا اطمینان حاصل کرتے تھے۔ عقل پرست گروہ نے تلوار سے اُنھیں قائل کرنا چاہا، تو وہ نئی راہ سے اور بدکے۔ مذہب و فلسفہ کی یہ کشمکش ۲۳۲ھ تک حکومت کی حکمت عملی پر مؤثر رہی، متوکل کے تخت نشین ہوتے ہی عقل پرستوں کا ستارہ گردش میں آیا، ملت نے تقلید کو دماغی پریشانیوں سے بچنے کا ذریعہ جانا، اور "معتزلیت" کے بجائے "حنبلیت" حکومت کا مذہب بنی۔

سلف صالحین کی کوری تقلید دلوں کو کب تک تسکین دیتی۔ عقل کی زبان یہ کہہ کر کب تک بند کی جاتی کہ سلف صالحین اس قسم کی گفتگو پسند نہ فرماتے تھے۔ عقل پرستوں کی تحریک اندر ہی اندر سرگرم عمل رہی۔ ۳۲۰ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے اس تقلیدی تحریک کو عقل و فلسفہ سے قریب کرنے کی طرح ڈالی۔ امام صاحب خود عقل پرستوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چالیس دن کی سخت کشمکش کے بعد ایک جمعہ کو آپ نے بصرہ کی جامع مسجد میں عقل پرستی سے توبہ اور سلف پرستی پر ایمان

کا اعلان کیا، اور عقلی حربوں سے تقلیدی تحریک کو نئی زندگی بخشی۔ اشعریت دنیائے اسلام پر چھا گئی، اور کوری بے عقل تقلید اور خالص عقل پرستی کا سکہ دلوں سے اٹھنے لگا۔

زمانہ آگے نکل گیا اور اشعریت جامد کی جامد رہی۔ نئے خیالات اور بدلے ہوئے حالات نے اشعریت کی بنیادیں ہلا دیں، سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اشعریت بے جان قیود میں اسیر تھی۔ عوام بجس اور علمار غافل تھے تصوف، شرعی اور اخلاقی پابندیوں سے نکل جانے کے لئے بیتاب تھا۔ جو شخص اخلاقی قیود یا آئینی پابندیوں سے گھبراتا، وہ تصوف میں پناہ لیتا، فلسفی افکار بے معنی استدلات اور بیکار کی دردسری سے آگے نہ بڑھنے پائے تھے، زندگی کا کوئی اساس نہ تھا جو قلب کو اطمینان اور دماغ کو سکون بخشتا، باطنی تحریک نے عالم اسلام میں انتشار پیدا کر دیا تھا حسن بن صباح کے فدائیوں کی وجہ سے کسی کی جان محفوظ نہ تھی، اور اس کی باطنی تعلیم کی سحر کاریوں نے دل و دماغ کو اضطراب میں ڈال دیا تھا۔ اس نازک وقت میں (سنہ ۴۵۰ھ) امام غزالی پیدا ہوئے۔

امام غزالی نے فلسفہ و منطق کی غلط کاریاں آشکارا کیں۔ عقلی فیض سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کو اپنی حد سے بڑھنے سے روکا، مذہب کو جامد قیود سے نکالا، اور اسے اس کے اصلی سرچشمہ یعنی وجدانی زندگی سے آشنا کرنے کی کوشش کی، تصوف کو بے راہ روی سے باز رکھا، اشعریت کے جمود کو توڑا اور باطنی تحریک کی گمراہیاں واضح کیں۔

امام صاحب صحیح معنوں میں محی الدین والملت تھے۔ ان کی لگائی ہوئی پود سے آگے چل کر مولانا رومی جیسے صاحب کمال پیدا ہوئے،

جنھوں نے خود بادۂ حقیقت سے سرمست وسرشار ہوکر دوسروں کو بھی اس شراب سے مست کر دیا۔ لیکن یہ سرمستی اور جنون عوام کی سطح سے بہت بلند تھا، وہ اس نشہ میں کہیں اور بہک گئے اور وجدانی زندگی شرح وآئین کی قیود سے نکل کر قوم کے دلوں اور دماغوں کو خراب کر گئی۔

زمانہ بھی نازک تھا، زندگی کی مصیبتیں بڑھتی جاتی تھیں، مسلمانوں کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہوچکی تھی، آپس کی خانہ جنگی نے ذہن پہلے ہی بے حال کر دیا تھا کہ مغرب سے صلیبی حملوں کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کو دوسو برس تک ان کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس صدمہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ منگولیا سے تاتاری سیلاب اٹھا اور دنیائے اسلام کو قتل وغارت میں غرق کرتا نکل گیا۔ ان حالات میں امام غزالی اور مولانا روم کی تعلیمات کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکلا تو تعجب کی کونسی بات ہے۔

ملت اسلام کے قوائے حیات کا اضمحلال پے درپے جنگوں اور بے انتہا خوں ریزیوں کے بعد ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لئے نامساعد تھا۔ قوم کی طبیعت پر فرسودہ، سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب آگئی۔ غزالی اور رومی اصلاحی تحریک کا یہ حشر ہوا۔ ان کے بعد امام ابن تیمیہ نے "رجوع الی الاسلاف" کی تحریک سے ملت کی رگوں میں تازہ خون زندگی پیدا کرنا چاہا۔ لیکن تقلید اور عدم تقلید کی فروعی بحثوں نے مسلمانوں کی تعمیر حیات کی کوششیں کامیاب نہ ہونے دیں، اور مسلمان زندگی کا کوئی صحیح اور پختہ نصب العین نہ بنانے پائے۔

زوال اور انحطاط کا یہ طویل زمانہ ۱۲۵۶ھ سے ختم ہوتا ہے تاتاریوں کی تباہ کاریوں نے مسلمان قوم کی ذہنی زندگی کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا، جس سے وہ پھر سنبھل نہ سکی، اور "مسلمان در گور اور مسلمانی در کتاب" تک حالت پہنچ گئی۔ تصوف توہم پرستی کا دوسرا نام تھا، مذہب اندھا دھند دوسرے کے بنائے ہوئے رستہ پر چلتا تھا۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کی بجائے وہ اکرم سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ "اعمیٰ" ہو۔ اجتہاد کا دروازہ بند اور تقلید عین دین قرار پائی۔ عوام زندگی کے شعور سے کلیۃً خالی ہو گئے۔ علماء اور فقہا موجود رہے، لیکن ان کا وقت درباردار ی اور مذہبی قیاس آرائیوں میں کٹنے لگا۔ الغرض اسلامی دنیا پر ایک موت کا عالم طاری تھا، اور یورپ نئی زندگی کے تازہ خون کے نشہ میں سرشار ہو رہا تھا۔ زبردست کا کمزور پر چڑھ دوڑنا فطری تھا۔ مراکش سے لے کر ہندوستان تک تمام کی تمام اسلامی دنیا یورپی شاہ سواروں کے گھوڑوں کے قدموں سے پامال ہو گئی لیکن ع

ملک ہاتھوں سے گیا ملّت کی آنکھیں کھل گئیں

اور یہ کیوں نہ ہوتا قدرت کا دستور یہی ہے ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　　می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ملت کی بنائے کہنہ کو بالکل ویران کر دیا اور اس کامل تخریب کے بعد اب صحیح تعمیر کا دور شروع ہوتا ہے ؎

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے　　　اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اس منزل تک پہنچتے پہنچتے ملت اسلامی کے قافلہ کا گذر کن کن مراحل سے ہوا، اس کو "در حدیث دیگراں" کے پیرایہ میں اقبال یوں بیان فرماتے ہیں ؎

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورش اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

علما و فقہا، صوفیا اور مجتہدین کی "عصمت" حرف غلط بن کر رہ گئی، عثمانی خلافت کا طلسم اور ایرانی شہنشاہیت کا ڈھونگ بے نشاں ہو گیا، مسلمان کا جسم، اس کا دل، اس کا دماغ اور اس کی روح، روحانی اور سیاسی استبداد سے آزاد ہو گئی۔ آج لذت تجدید سے ہر مسلمان سرمست ہے۔ کہنہ پرستی کا جنازہ نکل چکا۔ جمہورِ ملت کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔ دلوں میں ولولے اور دماغوں میں محشر انقلاب بپا ہے ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

طویل اندھیری رات کے بعد اب افقِ اسلام سے نیا آفتاب اُبھر رہا ہے۔ اب ظلمت کو قرار کہاں، نیند کا زمانہ گیا ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی

دنیا دگرگوں ہے، نوجوانوں کے افکار زیر و زبر ہو گئے، محشر کی گھڑی ہے اور "عالمِ نو" کی تخلیق عمل میں آ رہی ہے ؎

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا

روحِ مسلمان میں یہ اضطراب کیوں ہے، اور اس سے کیا انقلاب ہونے والا ہے، یہ راز کون حل کرے؟

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب | رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا | گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اس رازِ خدائی کی پردہ کشائی مصلحت زمانہ کے خلاف ہے، یہ باتیں ابھی محرمانِ راز تک ہی رہیں تو مناسب ہے ؎

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں | میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے | لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اس عالمِ نو کی بنیاد پڑ چکی ہے، افکارِ تازہ کی خود تمہید ہے، جہانِ تازہ کی تخلیق سے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود | کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(۵)

اقبالؔ اس "عالمِ نو" کی منزل کا حدی خواں ہے، اور اس کی بانگِ درا پر ہمارا کارواں منزلِ مقصود کی طرف جا رہا ہے۔ یورپ کے سیلاب نے ہمارے سیاسی صنم توڑے، اقبال نے ہمارے ضمیروں اور ہماری روحوں کو آزاد کیا، ہمارے سامنے "عالمِ نو" کو پردۂ تقدیر سے بے نقاب کر دیا، اور مصطفویؐ شانِ انقلاب، مرتضویؓ ہمت اور صدّیقیؓ سوز پیدا کر کے اس "عالمِ نو" کی تعمیر کی دعوت دی۔

اقبال، غزالیؔ اور رومیؔ کی انقلاب آفریں روحوں کے مظہر ہیں۔ اُنھوں نے ان کے کام کو انجام تک پہنچایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزالیؔ اور رومیؔ کی تجلیات سے ملت کے ضمیر میں نورِ حقیقت ضرور چمکا تھا، لیکن زمانہ کی بے بصری کی وجہ سے وہ نور زندگی کو روشن نہ کرنے پایا بلکہ اس نور کو باطل کے لئے شمعِ راہ بنایا گیا۔ امام ابنِ تیمیہ نے اس نور باطل سے ملت

کے خرمن کو غلط کاروں کے ہاتھوں سے جلتا دیکھا تو انھوں نے منزل مقصود سے بھٹکے ہوئے قافلہ کو از سرِ نو آغاز منزل کی طرف چلایا تاکہ وہاں پہنچ کر وہ غلط سمت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور سیدھی راہ پر ہولے۔ لیکن اُن کے جانشین آغاز منزل ہی کو مقصود سفر سمجھنے لگے، زندگی کی جادہ پیمائی غیر ضروری ٹھہری، اور انھیں سلامتی بر کنارِ ساحل نظر آئی۔ تجدید و تخلیق گناہ اور تعطل اور تقلید ثواب قرار پایا، اور امام ابن تیمیہ کی آتش انقلاب سے نکلنے والے شعلے پیروان امام کے دلوں میں پہنچ کر سرد ہو گئے۔ نہ صوفیوں میں مستیٔ حق رہی اور نہ علمبردارانِ انقلاب میں آتشِ تخلیق، ملت کا ضمیر سوز یقین اور ذوق عمل دونوں سے خالی ہو گیا، اور مسلمان راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا ؎

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ کلام خطیب میں وہ لذّت شوق ہے، اور نہ صوفی میں محبت اور حمیّت ؎

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذّت شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سُلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عشق کی آگ بجھ گئی تو زندگی بے روح ہو گئی، اور خودی کا شرارہ سرد پڑ گیا،

ذوقِ نمود اور خود نمائی کا جذبہ فنا ہو گیا تو خدا شناسی کیسے رہتی ؎

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا راز داں پیدا

خودی نہ رہی تو حرم خدا سے خالی ہو گیا اور دیر کی بھی آگ ٹھنڈی ہو گئی، نہ کافر میں انکار کی جرأت رہ گئی اور نہ مومن میں یقین کا ولولہ ؎

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری
کہ خاوران میں ہے قوموں کی روح تریاکی

اہل مشرق کا مذہب تریاکی (افیونی) ہو گیا، اور جیتے جی زندگی کا انکار کیا جانے لگا مُوتُوا قبل اَن تَمُوتُوا روحانی ترقی کا درجۂ کمال قرار پایا، لیکن زمانہ کا تازیانہ سخت ہوتا ہے، حوادث اور واقعات کی مار بڑی گہری نیند سونے والے کو بھی بیدار کر کے رہتی ہے، قلب و نظر کی ناپاکی سے جو حجابات پیدا ہو جائیں ان کو نذر آتش کرنے کا کام زمانہ خوب انجام دیتا ہے، مسلمان کے ضمیر کے پردے اسی آگ کے شراروں سے جل کر نئے ایمان، نئے جوش و ولولہ اور نئی روح کو بے نقاب کر گئے۔

اقبال کا دل وہ آتش کدہ ہے جہاں سے یہ شعلے نکلے ہیں ؎

عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلہ میں ہے سرکشی و بیباکی

ان خس و خاشاک کے جلتے ہی دنیا بدل گئی، مذہب تریاکی مذہب شاہین بن گیا، بے خودی تعمیر خودی میں بدلی، پر شکستہ فضائے نیلگوں میں اپنی پرواز دکھانے لگا۔

جو کو کنار کے خوگر تھے اُن غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند

یہ سوز و اضطراب، یہ ولولۂ انقلاب و جوش و جنوں، یہ یقین و ایمان، یہ آفاق گیری کے ولولے اور زمان و مکان، حور و جبرئیل سے گذر کر یزداں

بر کمند ڈالنے کے حوصلے کس کے فیض نظر سے ہیں اور یہ "زمین و آسمان مستعار" کس کے شعلوں سے بھڑک رہے ہیں؟

بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن — عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

(۷)

اقبالؔ سرتاپا انقلاب ہے۔ اس کا وجود آتش عشق میں جل کر مجسّم انقلاب بن چکا ہے۔ انقلاب حدود و قیود کے دائروں میں مقید نہیں ہوتا، انقلاب جوہر انسانیت ہے۔ اس کی دعوت انسانیت کی طرح ہمہ گیر ہوتی ہے، اور اس کا ترجمان فرقوں ملتوں قوموں اور وطنوں سے بالا ہے۔ وہ انسان ہے صرف انسان، اس کی دعوت سب نوع انسان کے لئے ہے ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمر قند

اقبالؔ کے پیغام کی طرح اس کی ذات بھی ہمہ گیر ہے۔ وہ "برہمن زادہ" ہے۔ تخیل کی بلند پروازی اُسے آبائی دماغ سے ملی۔ قلب و دماغ کو ذوق و سوز اور ایمان و حُسنِ یقین عربیت نے عطا کیا۔ ساز و طرب، حسن پرستی اور خودمستی سرزمین شیراز سے پائی ؎

تنم گُلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر — دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

یورپ نے فکر کو جلا بخشی، ایمان مشرق سے اور حقائق پرستی مغرب سے حاصل کی، انسانیت کے ان مختلف اجزا نے اقبالؔ کے ہمہ گیر وجود کو ترکیب دیا اور کل نوع انسان کے ذہنی، فکری، روحانی اور علمی چشمہ ہائے فیض نے اُس کے دل و دماغ کو سیراب کیا، اور اس کی زبان ان علمی اور روحانی حقائق کی ترجمان بنی۔

اقبال انسانیت کے اس درجۂ کمال تک بڑی جاں کاہیوں اور سخت جدوجہد کے بعد پہنچا۔ مردانِ خدا کو اگر اس راہ میں نورِ ہدایت نہ ملے تو وہ بھٹک کر کہیں اور کو چل دیتے ہیں۔ نٹشے کی روحِ حقیقت طلب تلاشِ حق میں کہاں سے کہاں بہک گئی اور یہ مجذوب افرنگی مقامِ کبریا سے محروم ہی رہا۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

پہلے اقبال اپنے حیوانی وجود کی خواہشات اور ذات کے سفلی مظاہر سے وطن کی پہنائیوں میں اُلجھا، وطن کی پرستش سے طبعِ بلند بال کو تسکین نہ ہوئی تو اسے عقل و فکر کی دنیا کی تسخیر میں چندے راحت ملی۔ یہاں سے نکل کر وہ ذوق و شوق کے مقامات طے کرتا مقامِ حضوری تک پہنچ گیا۔ یہ مقام سخت مشکل ہے، اس میں بڑوں بڑوں کے قدم پھسل گئے، لیکن اقبال کا دل و دماغ اس نازک مقام پر بھی بہکنے نہ پایا۔

پہلی منزل کے تاثرات اکثر صفحۂ کاغذ پر نہ آسکے۔ ایک اضطراب و ہیجان کا عالم ہے جو "حسنِ حقیقت" کے فراق میں ہر حسینِ تازہ سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، لیکن طلبِ کمال کا جنون، آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا، عینِ شغلِ مے میں پیشانی سجدہ ریز ہے حسنِ نسوانی کی بجلی حسنِ حقیقت کی تڑپ پیدا کرتی ہے۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو — رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا — زینتِ گلشن بھی ہے آرائشِ صحرا بھی ہے
ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز سے — اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے
عینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے — پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

شباب آہ کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے

اور جوانی کا عقیدہ اُس کے نزدیک "عشرتِ امروز" ہے۔

عقیدہ "عشرتِ امروز" ہے جوانی کا

طبیعت کا حال یہ ہے ؎

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حُسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

دل میں ہر دم ایک نیا محشر بپا ہے، لذت طلبی سے تسکین نہیں ہوتی، دلِ برق آشنا، نسوانی حسن کے تنک جلووں سے سیر نہیں ہوتا۔ کیفیتوں کی رستخیز نے دل میں قیامت کا نقشہ کھینچ دیا ہے، اس اضطراب میں دل کی زبان سے فریاد نکلتی ہے ؎

محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حُسن
پھر تخیل کس لئے لاانتہا رکھتا ہوں میں

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

اپنے مقاصد کی بلندی اور ذاتِ حق کی کوتاہیاں پریشان کرتی ہیں ؎

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں، اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں

طبیعت کی بے حالی اطمینان چاہتی ہے، اور دلِ مضطر قرار کا طالب ہے۔ سب دروازے کھٹکھٹاتے ہیں لیکن وصال کی طمانیت نہیں ملتی، زاہد کی زبان سے اپنا حال کہتے ہیں ؎

سمجھا ہے کہ ہے برگِ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی

کچھ عار اُسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پُرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

مجموعہ اضداد ہے اقبال نہیں ہے — دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف — پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

ان سب مشاغل، جد و جہد اور تلاش و اضطراب کے باوجود وہ اپنی ذات کے مقصود حقیقی کو نہیں پاتے ؎

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے میرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اشک شوئی کے لئے وہ وطن کا بت تراشتا ہے اور خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا مان کر دیر و حرم کی گمراہیوں نے جو جلن پیدا کر دی تھی وہ دور کرنا چاہتا ہے ؎

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوٹے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

وہ اس دیوتا کی عبادت کے لئے نیا شوالہ تجویز کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے دل کی اجڑی بستی آباد ہو جائے گی ؎

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

"حسن حقیقت" کا طالب وطن کی چار دیواری میں اپنی فطرت کی جولانیاں اور اس کے تنگ جلوہ میں اپنا لا انتہا "تخیل حسن" کس طرح محدود کرتا، اس کی پرواز نے ملت اسلامیہ کی وسعت آفاق کو غنیمت جانا اور وطن پرست اقبال "مسلمان" پرست اقبال کے رنگ میں جلوہ گر ہوا۔ وہ نازنینانِ ہند کو چھوڑ کر رخ سعدی و سلیمٰی میں محو ہونے کی دعوت دیتا ہے ؎

رخت جاں بتکدہ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو محو رخ سعدی و سلیمٰی کر دیں

وہ صقلیہ دیکھتا ہے تو اسے حجازی صحرا نشین یاد آتے ہیں، جن کی تلوار دل

نے شہنشاہوں کے درباروں میں زلزلے ڈال دیئے تھے اور جن کے ظہور نے عصر کہن کو فنا کیا اور جہانِ تازہ کو نمود بخشی۔ وہ بغداد اور غرناطہ کو یاد کرتا ہے، اور اسی سلسلہ میں اُسے دہلی یاد آتی ہے۔ سطوت و عروج کی اس داستان کا تصور اُسے بیخود کر دیتا ہے، اُس کی آنکھوں سے موجودہ تباہی دیکھ کر گو خون کے آنسو بہ نکلتے ہیں، لیکن اس کا دل یہ مان نہیں سکتا کہ یہ پُرسطوت اور باعروج قوم کبھی مٹ سکتی ہے ؎

جب تلک باقی ہے تو، دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

لیکن حیدر آباد میں گورستان شاہی کا یہ اثر منظر اسے مسلمان پرستی کے محدود دائرہ سے ایک وسیع تر فضا میں پہنچاتا ہے۔ گورستان دیکھ کر موت کی تلخ حقیقت کا احساس چشم بصیرت اور نگاہِ چشم کے سامنے ایک ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تخیلی دنیا کی نازک عمارت اس حقیقت کے سامنے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ گو دل میں عہد رفعت کی یاد باقی ہے، لیکن اس امر واقعہ سے انکار کی مجال نہیں رہتی ؎

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے اُن کی بہار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

مصر و بابل مٹ گئے، مہر ایران اجل کی نذر ہوا، عظمت یونان و روما کو زمانہ نے لوٹ لیا، اس قانون فطرت سے مسلمان کیوں بچتے ؎

آہ! مسلم بھی زمانہ سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابر آزادی اٹھا، برسا، گیا

فطرت کا یہ اٹل قانون اس کے حکمت آفریں دل پر ہویدا ہو گیا، لیکن محبت آشنا دل پھر بھی غمگین ہے ؎

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غم ملّت ہمیشہ تازہ ہے

پرانی داستانِ سطوت و عظمت بھلائی نہیں جاتی اور پرانے اُجڑے ہوئے بام و در چشمِ تر کو اشکباری پر اکسانے سے باز نہیں آتے ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں
اشکباری کے بہانے ہیں یہ اُجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر

لیکن ایک حقیقت ابدی ان سب غموں کو سامانِ تسکین دیتی ہے، اور مسلمانوں کی تباہی کا زخم اس اطمینان سے اچھا ہو جاتا ہے کہ ؎

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

اسلام کی اس شانِ جمالی کی شمعِ حقیقت کے انوار سے اقبال کا دل انسانیت کے بلند مقام کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے میں اُسے پیچ در پیچ راستوں سے گذرنا پڑا، وہ اِدھر اُدھر بہت بھٹکا۔ کبھی عقل نے رہنمائی کی، وہ عاجز آئی تو دل نے راستہ دکھایا، دل کے واردات پر عقل نے بے یقینی اور اضطراب کا اظہار کیا۔ معلوم نہیں کن کن آشوب ہائے قیامت سے گذر کر اقبال اس منزلِ اقدس تک پہنچا۔

اقبال سے پہلے بہت سے مردانِ خدا اس دشوار گذار راستہ سے گذر چکے ہیں۔ غزالی کی "منقذ من الضلال" اور رومی کی مثنوی اس راہ کے تاثرات و احساسات اور تجربات و مکاشفات کی آئینہ دار ہے۔ غزالی کو دس بارہ برس حجابات اور مجازات کے پردے ہٹانے میں لگے، لیکن مولانا روم کے دل میں شمس تبریزی کی ایک نگاہ نے وہ آگ لگائی کہ ان کی چشمِ بصیرت نے حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا، اور اس کی سرمستیوں اور عالم افروز شعاعِ حسن نے دلوں کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اقبال کے شمس تبریزی مولانا روم ہیں ؎

اُسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اُسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

بیا کہ من زخمِ پیرِ روم آوردم — مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

مرشد رومی کے فیض سے اقبال کی حقیقت طلب فطرت پر انسانیت کے اس "مقامِ کبریا" کی تجلیات کا پرتو پڑا اور موت و زندگی، فنا و بقا، مجاز و حقیقت، قدرت، وحدت وجود، وحدت شہود، عقل و دل اور مذہب و فلسفہ کے تمام حجابات اٹھ گئے، اور اقبال نے حریم ذات میں ذاتِ حق کا عکس بے نقاب دیکھا۔

اِسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

می کشودم شبے بہ ناخنِ فکر — عقدہ ہائے حکیم المانی
چوں بدریائے او فرو رفتم — کشتیٔ عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونے — چشم بستم ز باقی و فانی

لیکن عقل کی ان اُلجھنوں سے یوں نجات ملتی ہے، کہ پیرِ رومی ظاہر ہوتے ہیں۔ اُن کے آفتاب کی تجلیوں سے روم و شام کے آفاق نورانی ہیں، اور دنیا کی شب تاریک میں اُن کا شعلہ چراغ رہبانی کا کام کرتا ہے، اور اُن کے حرف لالہ ہائے نعمانی کی طرح معانی کی جلوہ ریزی کرتے ہیں۔

نگہ شوق تیز تر گردید — چہرہ بنمود پیر یزدانی
آفتابے کہ از تجلیٔ او — اُفق روم و شام نورانی
شعلہ اش در جہانِ تیرہ نہاد — بہ بیاباں چراغِ رہبانی
معنی از حرف او ہمی روید — صفتِ لالہ ہائے نعمانی

رومی شاعر کو عقل کے ان طوفانوں میں دیکھ کر فرماتے ہیں ؎

گفت با من "چہ خفتۂ ابر خیز | بہ سرابے سفینہ می رانی!
بہ خرد راہ عشق می پوئی | بہ چراغ آفتاب می جوئی"

خرد عشق کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے، رازی ہارتا ہے اور رومی کی جیت ہوتی ہے ؎

نے مہرہ باقی، نے مہرہ بازی | جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی

مرشد رومی کا فیض اقبال کو دانش حاضر کی آگ سے بھی ابراہیم کی طرح صحیح وسلامت نکال لیتا ہے ؎

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں | کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

مقام عقل سے تو اقبال آسانی سے گذر گیا، لیکن مقام شوق کے نشیب و فراز کی کوفتیں بھی آسان نہ تھیں ؎

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال | مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ دیوانہ

مقامِ شوق میں اُسے وجود مصطفویت کی شمع نورانی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ ضمیر انسانی کی حقیقت کو پالیتا ہے، اور دنیا کو انسانیت کے مقصود اصلی کی طرف بلاتا ہے ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست | اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

یہ وجود مصطفویت کیا ہے، اس کی حقیقت منصور حلاج کی زبان سے بیان فرماتے ہیں ؎

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است | خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالاتر است | زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

جوہر اُو نے عرب نے اعجم است — آدم است و ہم زآدم اقدم است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں — عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ایں سراپا انتظار، اُو منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست — ما ہمہ رنگیم، اُو بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا است — عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست
کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو ہُو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت — تا نہ بینی از مقامِ مارمیت

بگزر از گفت و شنود اے زندہ رود
غرق شو اندر وجود اے زندہ رود

وجودِ مصطفویت ذاتِ باری کے کمال کا مظہر ہے۔ یہ وجود انسانی ہے اور اس کا کمال ذاتِ باری کے کمال کا پیکر ہے، اس لئے انسانِ کامل ذاتِ خداوندی کے نور کا مادی وجود ہے، اور اس مقام پر پہنچ کر انسان کامل یعنی وجودِ مصطفویت خود وجودِ حق ہو جاتا ہے۔

ع فاش تر خواہی بگو ہُو عبدہٗ

قرآن نے اسی حقیقت کی طرف آیت "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" میں اشارہ کیا ہے۔

صاف الفاظ میں اقبال کہتا ہے کہ انسانیت کا نصب العین خدا بننا ہے اور یہ نصب العین اسلام کی شانِ جمالی کی اصلی

تفسیر ہے۔ اسلام کی شانِ جمالی اور اصطلاحی مسلمانی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسلمانی کی دو حیثیتیں ہیں، ایک جذبِ مسلمانی، دوسری شرعِ مسلمانی۔ جذبِ مسلمانی اسلام کی شانِ جمالی ہے اور اس کی تعریف یہ ہے۔

جوہرِ اُو نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است

اُردو میں اس جذبِ مسلمانی کی صراحت فرماتے ہیں سے

اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرِّ فلک الافلاک
اے رہروِ فرزانہ بے جذبِ مسلمانی
نے راہِ عمل پیدا نے سوزِ یقیں نمناک

---

(۸)

اس بلند مقام سے اقبال زندگی کے حقائق پر نظر ڈالتا ہے۔ وجودِ مصطفویت کے فراق میں اضطراب و بیقراری اور اس تک پہنچنے کے لئے عزم و یقین اور ذوق و شوق کی بیتابی اور تڑپ عشق ہے۔ اس راہ دور و دراز کو قطع کرنے میں پیہم کشمکش اور مسلسل جد و جہد کا نام اعمالِ صالحہ ہے۔ اسلام کے اس تخیل کو وہ جماعت انسانی کی فلاح و بہبود کی اساس قرار دیتا ہے، اور جب کوئی کوشش اس تخیل کو پست کرنے کی کی جاتی ہے تو وہ اسے کفر قرار دیتا ہے۔

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

سطح میں ملّت اور وطن کی بحث میں پڑ گئے، اور فقہی اور لغوی بحثوں میں اقبال کا مطلب اصلی نہ سمجھ سکے۔ ملّت سے اقبال کی مراد اسلام کا یہ تخیل ہے، جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اس تخیل میں وہ کسی قسم کی لوچ کے قائل نہیں۔

(۹)

اب سوال یہ ہے کہ اقبالؔ کے ھُوَعبدہٗ سے پہلے یہی نغمہ منصورؔ اور بایزید بسطامی اور معلوم نہیں کن کن بزرگوں کی زبان سے گایا جا چکا ہے۔ اقبالؔ وجود مصطفویت یا انسان کامل کو ہُوعبدہٗ کہتا ہے، منصورؔ نے "انا الحق" اور بایزیدؔ نے "سبحانی ما اعظم شانی" فرمایا۔ یہ بلند آہنگ دعاوی مجذوب کی بڑ سمجھے گئے اور انسان کی اس بلندیٔ نصب العین کی حیثیت مقالی کی مقالی رہی اور عملی لحاظ سے وہ زمان و مکان اور جسم و جان کی مادی اور وہمی زنجیروں سے باہر نہ نکل سکا۔

اس "ھُوَعبدہٗ" کے تخیل سے زندگی کو کیا حاصل ہوا، اور اقبالؔ کی اس "نکتہ آفرینی" سے کیا فائدہ، لیکن اقبالؔ تو اس "ھُوَعبدہٗ" کو حاصل کرنے کی راہ بتاتا ہے، وہ فرد کو خودی کی تعلیم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خودی کا شعور خود زندگی سے عبارت ہے۔ خودی جتنی مضبوط ہوگی اسی قدر زندگی میں اُستواری پیدا ہو جائے گی اور جب زندگی زورِ خودی سے مُسلّح ہو جاتی ہے تو زندگی کی جوئے کم آب قلزم میں بدل جاتی ہے ؎

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی | پس بقدرِ استواری زندگی است
چوں خودی آرد بہم نیروے زیست | می کشاید قلزمے از جوئے زیست

خودی کو استحکام نصب العین سے ملتا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعا است — کاروانش را درا از مدعا است

اس مدعا کے ساتھ ذوقِ یقین اور اس کے حصول میں عزم کا ولولہ عشق ہے۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی ست — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

از محبت می شود پایندہ تر — زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

یہ مدعا کیا ہے، وجودِ مصطفویت کا قرب یا حصول، اور اس کے لئے کائنات عالم کی تسخیر ضروری ہے۔ یہی عمل ہے اور اسی سے زندگی کو بقا نصیب ہوتی ہے، اور انسان ذاتِ سرمدی سے مل جاتا ہے ؎

از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرماندۂ عالم شود

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرّۂ تعمیر کرد

تا ز تسخیرِ قوائے ایں نظام — ذوفنونیہائے تو گردد تمام

جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن

محسوسات اور موجودات کی تسخیر ہی لا الٰہ الا اللہ کا حاصل ہے ؎

ہر کہ اندر دست او شمشیر لا ست — جملہ موجودات را فرمانروا ست

موجودات کی تسخیر سے انسان نائب حق بنتا ہے، اور نیابت آلٰہی کے مدارج کا درجۂ کمال مصطفےٰ ہے ؎

از شتربانی جہاں بانی کنی — زیرِ سر تاجِ سلیمانی کنی

تا جہاں باشد جہاں آرا شوی — تاجدارِ ملکِ لا یبلیٰ شوی

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است

جب انسان نیابت آلٰہی کے منصب پر سرفراز ہوتا ہے تو اس کا ہاتھ

اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے، اور وہ دنیا میں خدائی کرتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشت او شق می شود

اس نائب حق کے اشارۂ انگشت سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ زمانہ کا رہوار اُس کی مہمیز سے تیز تر بن جاتا ہے۔ اس کی ہیبت سے دریائے نیل خشک ہو جائے اور مُردے قبروں سے جی اٹھیں ؎

خشک ساز د ہیبت او نیل را می برد از مصر اسرائیل را

از قُم اُو خیزد اندر گور تن مردہ جاں ہا چوں صنوبر در چمن

یہ نائب حق عالم خوب و زشت کا فاتح ہے، زندگی کو نیا جنم دیتا ہے، اور اسی کی ذات ہُوَ عبدہٗ کی مظہر بن جاتی ہے۔

زندگی را می کند تفسیر نو می دہد ایں خواب را تعبیر نو

حرام وہ ہے جس کو وہ حرام کہے، وہی حلال ہے جو اُس کے نزدیک حلال ہے ؎

تو ہے فاتح عالم خوب و زشت تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

اقبال کا یہ نعرۂ "انا الحق" محض مجذوب کی بڑ کی حیثیت نہیں رکھتا، وہ اس نعرے سے دل میں عمل کی جستجو اور ولولہ پیدا کرتا ہے، اور اسی پر جنت و دوزخ کی بنیاد رکھتا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال جب تعمیر خودی کی تعلیم دیتا ہے تو انسان کو خدا بننے کی دعوت دیتا ہے۔ ع

تعمیر خودی میں ہے خدائی

تعمیر خودی کے لئے پیہم کشمکش چاہیے، اور اسی کشمکش میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس راہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اقبال اسی پیام فطرت کا ترجمان ہے، اور اس کی ترجمانی وہ عشق اور عمل کی تعلیم سے کرتا ہے۔

(۱۰)

اقبال نے اس پیام فطرت کو جو خالص جوہر انسانیت کا مظہر ہے، کیوں قرآن، اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے جامہ میں پیش کیا، اور اس طرح اس عالمگیر اور ہمہ گیر تعلیم کو ایک خاص جماعت میں محدود کر دیا؟ دوسرے الفاظ میں اقبال نے انسانیت کے اس "مقام کبریا" کے بلند مرتبہ پر فائز ہو کر بھی اسلام کی چار دیواری کو جو مانا کہ بہت وسیع ہے کیوں پیچھے نہ چھوڑا اور انسانیت کی غیر محدود پہنائیوں میں داخل نہ ہوا؟

اقبال کا اسلام ان کے پیام کی طرح عالمگیر اور ہمہ گیر ہے۔ اُن کے نزدیک ملت اسلامی کا صحیح تصور اس پیغام کا اصلی جامہ ہے۔ اسلام کی روایات، اس کی تعلیمات اور تصور زندگی ان کے نصب العین سے ہم آہنگ ہے۔ جب وہ ملت اسلامیہ کو ذوق عمل کی تلقین کرتے ہیں تو

ان کے پیشِ نظر ملّت کا موجودہ سیاسی تصور یا اہلِ مذہب کا فقہی تخیل نہیں ہوتا، وہ ملّتِ اسلامی کی فطرت اصلی کو اپنے انسانی نصب العین سے قریب تر دیکھتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہی ملّت ان کی دعوت کو سُن سکتی ہے، اور یہی قیادت عالم کی اہل ہے ۔

ملّت اسلام وحدت انسانیت، وحدت مذاہب اور ایک بلند و برتر خدائی تصور کی قائل ہے ۔ رنگ و نسب کا تعصب اُن کے ہاں بالکل نہیں ۔ وہاں نہ رہبانیت ہے، اور نہ محض دُنیا پرستی ۔ حسنۃ فی الدنیا و حسنۃ فی الاخرۃ اُس کا شعار ہے ۔ اقبال اپنے "مثالی مسلمان" کی تعریف کرتے ہیں ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

اقبال کے نزدیک مومن کون ہے ؟

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں
قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ان اوصاف کا حامل مردِ مومن دنیا کی امامت کا سزاوار ہے، اس کا دستور امامت کیا ہے ؏

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ، مردوں کی شمشیریں

اقبال کے اس پیام کی بنیاد قرآن ہے۔ قرآن تمام بھولی بسری نسلوں کی واردات قلبی اور تسخیرات ذہنی اور زندگی کے ابدی اور زندۂ جاوید حقائق کا آئینہ دار ہے۔ قرآن گو عربی ہے لیکن وہ ترجمان جوہر انسانیت کا ہے ؏

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

جس دعوت کا اساس قرآن ہو وہ اقوام و ملل کی قیود سے بالا تر، رب العالمین کی طرح "عالمینی" ہوتی ہے، اس کا مقصود و مخاطب انسان ہے۔ اگر اس کے بعد بھی انسان پست ہی رہے، گو ایک گروہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے ترقی کے بلند ترین درجہ پر پہنچ جائے، تو یہ اس دعوت قرآنی کی ناکامی کی دلیل ہے ؏

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اقبال کی دعوت بیشک خالص "عالمینی" اور انسانی ہے، لیکن اس کا مخاطب اول ملت اسلامیہ ہے، اس لئے وہ اپنے پیام کو ان کے رنگ میں پیش کرنے پر مجبور ہے۔ قرآن نے گو عربوں کو مخاطب کیا، اور انہی کی طرز بیان اور ان کی زبان میں اپنے مطلب کو ادا کیا، لیکن اس کی دعوت

تمام نوع انسان کے لئے زندگی کا پیام ہے۔ اقبال کی دعوت میں یہی ہمہ گیری ہے۔ صاحب نظر الفاظ، استعارات اور اسلوب بیان کے حجابات اُٹھا کر بآسانی اس ہمہ گیری کو دیکھ سکتے ہیں معانی کچھ بھی ہوں، الفاظ کا جامہ پہنے بغیر بے حقیقت ہیں۔ یہ جامہ آسمانی تو ہونے سے رہا، زمینی ہوگا، اور خاص طور پر جانا بوجھا ہوا، اور موقع و محل کے مناسب ؎

حقیقت یہ ہے جامۂ حرف تنگ　　　حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ

حقیقت کی ترجمانی میں اس قسم کی دشواریاں اہل کمال کو اکثر پیش آتی ہیں۔ غالبؔ اس عجز کا اعتراف کرتا ہے ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ، و لے گفتگو میں کام　　　بنتا نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

حقیقت کے اس مجازی لباس کا راز رومیؔ نے بیان کیا ہے ؎

حرف قرآں را مداں کو ظاہر است　　　زیر ظاہر باطنے ہم قاہر است
زیر آں باطن یکے بطنے دگر　　　خیرہ گردد اندرو فکر و نظر
ہمچنیں تا ہفت بطن اے بوالکرم　　　می شمر تو ایں حدیث معتصم

بے بصر ظاہر کو اصل سمجھ لیتے ہیں، اور اہل بصیرت ظاہر سے آگے باطن کا ادراک کرتے ہیں۔

(۱۰)

اقبال نے اپنی دعوت کے لئے گو ملّت اسلامیہ کا مانوس جامہ مستعار لیا، لیکن اس دعوت کی روح خالص انسانی اور قیود و حدود سے بالاتر ہے ؎

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی　　　سکھایا اُس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں — حرفِ محبت ترکی نہ تازی

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

انسانیت کا اپنے وجود سے منکر ہونا انکارِ ذاتِ باری سے بھی بدتر ہے ؎

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است — منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

انسانیت کی تشنگی اور مے حقیقت کی کمیابی کی شکایت ہے، اور خدا سے بخل کا شکوہ کرتا ہے ؎

ترے شیشہ میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

انسان کی تردامنی دیکھی نہیں جاتی۔ اپنے دفترِ عمل کی سیاہی خالق کے دامنِ عصمت پر داغ دکھائی دیتی ہے ؎

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

انسان کی رفعت پر یقین ہے، انسان کا تقدیر میں قید ہونا کیسا، وہ خود تقدیر ہے اور تقدیر گر ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں — ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان کی پرواز زمان و مکاں تک محدود نہیں، وہ یزداں تک پہنچ کر رہتا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ

انسانیت کے کمال کا یہ عقیدہ اقبال کو مجبور کرتا ہے کہ وہ موت کو پیامِ فنا نہ سمجھے بلکہ اسے جستجوئے کمال کا ایک زینہ مانے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

اگر موت خدانخواستہ فنا کا پیام ہے تو انسان یوں زندگی گذارے کہ اس کو فنا کر کے خود خدا کو کفِ افسوس ملنا پڑے۔

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار می گردد

انسان کو یہ کمال یا بقا عشق سے حاصل ہوتا ہے عشق اور اجل کا مقابلہ ہو تو اجل خود فنا ہو جاتی ہے۔

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

انسانیت کا دوام عشق سے ہے اور عشق کے فیض سے انسان میں تسخیرِ کائنات کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور یہی ولولہ و شوق حاصلِ زندگی ہے۔ اقبال اُس جنت کے قائل نہیں جہاں ولولہ و شوق کا سامان نہ ہو۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے | کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

دلولہ و شوق کی کشمکش اور بلند سے بلند تر مقام تک پہنچنے کا اضطراب انسانیت کا اصل جوہر ہے ؎

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد | دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے | تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے | سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد | بہ نگاہ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

کمالِ انسانی کا یہ عقیدہ اقبالؔ کو دعوتِ انقلاب کا ترجمان بناتا ہے۔ وہ سکون وجمود کو موت یعنی کفر، اور انقلاب وحرکت کو ایمان قرار دیتا ہے، اور اسی لئے مسولینی کی تعریف کرتا ہے۔ ابلیس کے انکار کو سراہتا ہے اور لینن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کردۂ کارِ خداوندان تمام

نٹشے جیسا کافر اقبالؔ کو "قلب او مومن" نظر آتا ہے۔ وہ افلاطون سے بیزار ہے، کیونکہ اس کا فلسفہ گوسفندیت کی تعلیم دیتا ہے۔ حافظ شیرازی سے ناخوش ہے کہ اُس کے نغمے جاگتے کو سلا دیتے ہیں۔ اس کا اسلام تسبیح ومناجات کا اسلام نہیں، اقبالؔ کا اسلام بے پناہ جذبۂ عمل اور لامحدود سعیٔ پیہم سے عبارت ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدا مست | یہ مذہبِ ملّا و جمادات ونباتات

اقبال اپنی اس دعوت کا علمبردار "مردِ مسلم" کو بنانا چاہتا ہے، اور اس لئے اُسے تعمیرِ خودی کی تعلیم دے کر انسانیت کے "مقام کبریا" پر پہنچانا ہے۔ اس منزل کی راہ پیمائی کے لئے دلِ مرتضیٰؓ اور سوزِ صدیقؓ کی ضرورت ہے، لیکن یہ دل اور سوز کیسے پیدا ہو؟ وہ شراب کہن جس کی تاثیر نے کبھی انسانیت کا ضمیر روشن کر دیا تھا اور انسان کے دل میں سوز و ساز کی آگ پھونک دی تھی، اب روایات اور خرافات کے پردوں میں پوشیدہ ہے۔ مسلمان اب شعلہ عشق نہیں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے۔

اقبال پہلے مسلمان کو خود اس کی حقیقت بتاتا ہے کہ وہ کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دل بے نیاز

مسلمان کا یقین پرکار حق کا نقطۂ اصلی ہے۔ عقل کی انتہا وہ، عشق کا کمال وہ، اور زندگی کی ہائے و ہوٗ اسی کے دم سے ہے ؎

نقطۂ پرکار حق مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

مسلمان "مردِ آفاقی" ہے، وہ زمان و مکان سے بالا ہے، اس کی زمین بے حدود، اس کا افق بے ثغور ہے ؎

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اُس کی زمیں بے حدود اُس کا افق بے ثغور — اُس کے سمندر کی موج دجلہ و ڈینیوب و نیل

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے عجیب
عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل

مرد مسلماں ابدی ہے اُسے فنا نہیں۔ وہ ذات الٰہی کا مظہر ہے۔ جب ذات الٰہی ابدی ہے تو وہ کیوں مٹنے لگا۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سِرّ کلیم و خلیل

مرد مومن کسی کے بنائے ہوئے جہاں میں نہیں رہتا، وہ اپنی دنیا خود بناتا ہے۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

"مرد مومن" کا دستور حیات خود اس کا اپنا بنایا ہوا ہے، وہ کسی کی شریعت کا غلام نہیں، وہ قرآن کا قاری نہیں خود قرآن ہے ؎

تو ہے فاتحِ عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال کا "مرد مومن" تو یہ تھا، اور اِس زمانہ کا مرد مومن یہ ہے ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

صرف نمازی بننے سے انسان مومن نہیں بن جاتا ؎

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی میں بھی نمازی

جس قافلہ کے راہبر مُلّا ہوں اس کا انجام کیا ہوگا ؎

میں جانتا ہوں انجام اُس کا
جس معرکہ میں مُلّا ہوں غازی

فلسفی اور مُلّا دونوں ایمان کی آگ سے خالی ہیں، ایک کا دل مردہ ہے، اور دوسرا عقل سے محروم ہے۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

تصوف کا شعلہ بھی ٹھنڈا ہو گیا، اور اب صوفی میں بھی کچھ نہیں رہا ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی — فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز — کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

پیرِ حرم کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمان کا جامۂ احرام بیچ کھاتا ہے اور اُس کی زندگی بے روح ہو گئی ہے ؎

خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور — کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے — کردار بے سوز، گفتار واہی

مدرسہ اور خانقاہ دونوں اپنی حقیقت کھو چکے، اب ان میں کیا دھرا ہے ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک — نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

یہ انقلاب کیوں ہوا، اور مردِ مومن ذوقِ یقین اور سوزِ عمل سے کیوں محروم ہو گیا؟ اقبال کہتا ہے مسلمان نے اسلام کو نہیں سمجھا، اس لیے وہ جذبِ اندروں اور سوز دروں سے خالی ہو گیا، اور اس کا دل جو آتش انقلاب کا مرکز تھا، اب روایات اور خرافات پر جان دینے لگا۔

پیام مشرق کے مقدمہ میں فرماتے ہیں "مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنی خودی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ

لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے جزوی اور اجتماعی دونو پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

اقبال کی زندگی کا نصب العین زندگی کی ان ہی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ پہلے وہ انسانوں کے ضمیر میں اپنا "عالم نو" متشکل کرنا چاہتے ہیں، اور انہیں یقین ہے کہ اس کے بعد یہ عالم نو پردۂ وجود پر آکر رہے گا۔ ان کے آتشیں نغموں اور سوزِ درون میں ڈوبے ہوئے سُروں نے دلوں میں ایک قیامت بپا کردی ہے۔ ان کے آتش کدۂ دل سے نکلی ہوئی چنگاریوں نے سب خس و خاشاک کو جلاکر راکھ کر ڈالا اور آخر اہلِ نظر کی آنکھوں کے سامنے حقیقت اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہو گئی ؂

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کرکے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کرکے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ دردآشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑوں گا

اقبال کی پکار اَن سُنی نہ رہی، اُس کی مشتِ خاک نے پریشان ہو کر چمن اسلام میں، بہت سے دلِ دردآشنا پیدا کردیئے ہیں۔ اُس کے شعلوں نے نقوشِ باطل کے پردے جلا دیئے، اور حقیقتِ ازلی اب عریاں ہو چکی ہے ؂

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی
حرم کے پاس کوئی نغمہ سنج ہے عجمی
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

دعوت کی ابتدا میں دل برداشتہ تھے کہ کوئی ان کی بات نہیں سمجھتا تھا، سب بیگانے تھے، کوئی یگانہ نہیں تھا ؎

دل بدوش و دیدہ بر فردا استم ۔۔۔ درمیانِ انجمن تنہا استم
من مثالِ لالۂ صحرا استم ۔۔۔ درمیانِ محفلے تنہا استم

لیکن ان کی آتش نوائی کب تک بے اثر رہتی؟ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ۔۔۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اُن کی دعوت انقلاب نے دنیا اور ماورائے دنیا دونوں میں زلزلے پیدا کر دیئے ہیں ؎

مری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں ۔۔۔ غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

حور و فرشتہ اور خود ذاتِ باری بھی ان صداؤں کی پہنچ سے باہر نہ رہ سکی ؎

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں ۔۔۔ میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

(۱۲)

اقبال کا یہ شور و اضطراب، یہ آتش نوائی یہ شوق و ولولہ، اور یہ نعرہ ہائے انقلاب اس لئے ہیں کہ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ ۔۔۔ جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

اس عالمِ پیر کا کون وارث ہوگا، اور یہ پکا ہوا پھل دیکھئے کس کی جھولی میں پڑتا ہے؟

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح ۔۔۔ دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

اقبال سمجھتا ہے کہ اس پھل کی حقدار "ملتِ اسلامی" اور اُس کا "مردِ مومن" ہے ؎

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اس وراثت کا اہل بننے کے لئے نئی دنیا تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ کوفہ و بغداد پُرانے ہو گئے، روایات، تصوف، شریعت اور تمدّن کا اثاثہ خرافات سے زیادہ نہیں رہا۔ یہ تند شراب پُرانے جاموں میں کیسے سمائیگی ضرورت ہے تازہ بستیوں کی اور تازہ حرم کی ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

خدا تعالیٰ سے فرشتے شکایت کرتے ہیں کہ جہان فرسودہ ہو رہا ہے، انسان کا جوہر زندگی بجھ گیا ہے اور انسانی نقش کی یہ بے وقعتی خود نقش گر کے لئے توہین ہے ؎

جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیٔ نیام ابھی

اور خلق خدا اب تک رند و فقیہ اور میر و پیر کا شکار ہو رہی ہے ؎

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی

اور یہ حالت عظمت الٰہی کے منافی ہے، اور اگر نقش ناتمام نہ ہوتا تو عقل کیوں بے زمام رہتی اور عشق کو مقام کیوں نصیب نہ ہوتا ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اس پر خدا تعالیٰ فرشتوں کو عالم پیر کی تباہی کا فرمان دیتا ہے ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

خدا و مخلوق کے درمیان کیوں پردے رہیں ؎

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

کیوں، خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
لیکن اگر اہلِ دیر میں خلوص نہیں، تو حرم والوں کے سجدوں میں کیا باقی ہے؟
بہتر ہے حرم و دیر دونوں نہ رہیں ؎
حق را بسجودے صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
اقبال یہاں کمیونزم اور سوشلزم کا ساتھ دیتا ہے، لیکن اب وہ ایک اور چیز پیش کرتا ہے، کہتا ہے ہر نقش کہن بے کھٹکے مٹا دو، نہ بادشاہ رہیں نہ امیر، نہ فقیر، نہ ملا، نہ صوفی، نہ پادری۔ حرم و دیر کا وجود ختم کر دو، لیکن ایک دوسرا حرم ضرور بنا دو، خواہ وہ مٹی کا ہو ؎
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
لا الٰہ تک وہ سوشلسٹ انقلابیوں کے ساتھ ہے لیکن الّا کے اثبات میں وہ ان سے اختلاف کرتا ہے اور جنون تخریب اور شور رستخیز کے باوجود اس کی بدمستی اور سرزوری حرم کے غلاف کو سلامت رہنے دیتی ہے ؎
کمال جوشِ جنوں میں رہا میں گرم طواف خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

(۱۳)

آخر لا الٰہ میں یہ الّا کیوں؟ انسان اس حد سے بھی آگے کیوں نہ نکلے؟ یہ تو ہمات کی غلامی کیوں؟ جمال الدین افغانی کی زبان سے امت روسیہ کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتا ہے کہ تمہارا انقلاب لا الٰہ کی تعبیر ہے، تم نے واقعی "کار خداوندان" کیا، اس سے تیرہ سو برس پہلے انسانیت کی یہی خدمت مسلمان بھی ادا کر چکے ہیں ؎
تو کہ طرحِ دیگرے انداختی دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں قیصریت را شکستی استخواں

اس دنیائے پیر کو نئی ملّت کی ضرورت ہے، فرنگ کا آئین ودین کہنہ ہوگیا، تو کائنات کا کوئی اور اساس ڈھونڈھ سے

ملّتے می خواہد ایں دنیائے پیر — آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر
کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں — سوئے آں دیر کہن دیگر مبیں
کردۂ کار خداونداں تمام — بگذر از لا جانب الا اللہ خرام

یہ اساس ضروری ہے، کوئی عمارت اساس کے بغیر کھڑی نہیں ہوسکتی زندگی کی عمارت بھی بنیاد کے بغیر کیسے بن سکتی ہے سے

اے کہ می خواہی نظام عالمے — جستۂ او را اساس محکمے
در گزر از لا اگر جوئندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ

یہ الا اللہ کا اساس محکم قرآن کا حاصل تعلیم ہے، قرآن کیا ہے لا الہ یعنی عالم پیری کی شکست کا اعلان سے

نقش قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

اور الا اللہ یعنی نئے جہاں کی تعمیر، قرآن کے سرچشمۂ حیات سے جب جان میں تازہ خون پہنچتا ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جان کے ساتھ جہاں بھی بدل جاتا ہے سے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

امت روسیہ کو لا کے چکر سے نکل کر الا اللہ کے دائرہ میں آنا چاہیئے، یہی زندگی ہے اور اسی سے ثبات نصیب ہوسکتا ہے سے

آفریدی شرع و آئینے دگر — اندکے با نورِ قرآنش نگر
از ہم آں رمز حیات آگہ شوی — ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

اپنی آخری مثنوی میں اقبال لا الہ اللہ کی مزید تشریح فرماتے ہیں ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال — ملتاں را لا جلال الا جمال
لا و الا احتساب کائنات — لا و الا فتح باب کائنات

لا و الا جہان کیف و کم کے تقدیر گر ہیں لا سے زندگی میں حرکت اور الا سے سکون ملتا ہے۔ جب تک رمز لا سے واقف نہ ہو انسان غیر اللہ کے بندھنوں سے چھوٹ نہیں سکتا۔ جب لا کا جذبہ کسی زندہ مرد کے دل میں جلوہ افروز ہوتا ہے تو وہ اللہ بن کر رہتا ہے لا کا حاصل یہ ہے

لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے — ایں غورِ رعد است نے آوازِ نے
ضرب او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گرداب وجود

اس کامل شکست کے بعد نیا آدم کیا کرے، شکست کا سلسلہ کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ نفی ضروری اور بیحد ضرور ہے، لیکن نفی پر تو زندگی نہیں قائم ہو سکتی زندگی کا یہ احساس الا اللہ ہے۔ الا اللہ کا ماننے والا انسانیت کے کمال کا ماننے والا ہے، وہ انسان صدر نشین ہے، اس کی زندگی مشین اور تسخیر کائنات تک محدود نہیں رہتی۔ لا الہ الا اللہ کا حامل "فتوحات جہاں تحت و فوق سے گذر کر "جہاں ذوق و شوق" کی فتوحات کی مہم سر کرتا ہے ؎

غافل تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

(۱۳)

لا الہ الا اللہ کی یہ تعلیم بالکل بجا، لیکن اس تعلیم نے جو انسان پیدا کئے وہ کہاں ہیں؟ اگر یہی مسلمان جو اس تعلیم کے مدعی ہیں، واقعی لا الہ الا اللہ کے ترجمان

ہیں تو ان مردانِ مومن سے تو کافر و زندیق ہی اچھا، اقبال اس سے انکار کرتا ہے، اس کا "مردِ مومن" انسان کامل ہے۔ اُس کو یقین کامل ہے کہ یہ انسان کامل پردۂ وجود پر آ کر رہے گا، اُس کی ساری جد و جہد اور تمام سعی مسلسل کا حاصل اسی مرد مومن کو دنیا میں آباد کرنا ہے۔

اقبال اس شرابِ کہن کو پھر عام کرنا چاہتا ہے جس کی مستیوں نے کبھی دل مرتضیٰ، سوزِ صدیق، فقر ابوذر اور عدلِ فاروقی پیدا کیا تھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس شراب کی برکت سے اس کی اُمنگیں، اُمیدیں، جستجوئیں آرزوئیں، اس کے دیدۂ تر کی بے خوابیاں اور اس کے دل کی پوشیدہ بیتابیاں اس کے نالۂ نیم شب کا نیاز اور اس کا گداز انسانیت کے ضمیر میں ضرور متشکل ہو کر رہے گا اور اسی سے "مردِ مومن" اور عالمِ نو کی تشکیل ہو گی، وہ دعا کرتا ہے کہ یہ شراب عام ہو جائے ؎

میرے قافلے میں لٹا دے اُسے لگا دے ٹھکانے لگا دے اُسے

اُس کی نگاہوں کے سامنے "عالم نو" بے حجاب ہے۔

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

وہ جوانوں کو اس "عالم نو" کو دیکھنے کی دعوت دیتا ہے ؎

جوانوں کو میری آہِ سحر دے پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبال اس شراب کہن کی آتش عالم سوز کے لئے بیقرار ہے، خوش قسمتی سے زمانہ بھی خود اس کے لئے بیتاب ہے، اہل عالم "جہانِ نو" کے لئے ٹکٹکی لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، ہر شخص انتظار کی گھڑیاں گن رہا ہے، اقبال ساقی سے التماس کرتا ہے کہ وہ اہل عالم کو دعوتِ نائے و نوش دے ؎

پلاوے مجھے وہ مے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصل گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات — وہ مے جس سے ہے مستی کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل — وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس مے سے ضمیر انسانی میں اضطراب و ہیجان پیدا ہو کر رہے گا اور یہ دل مرتضیٰ اور سوز صدیق پیدا کرے گا یہاں سے انسان اس مقام کبریا پر پہنچے گا۔

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اُس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اُس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

قصہ کوتاہ انسان کی یہی سرنوشت ہے کہ وہ دنیا کے سامنے عالم خوب و زشت کے فاتح کی صورت میں جلوہ گر ہو سے

تو ہے فاتح عالم خوب و زشت — تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

اُس مقام کی کمال بلندی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بیان کے لئے الفاظ کا جامہ نہیں ملتا اور کلیم و طور کا معاملہ یاد آجاتا ہے سے

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ — حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

(۱۴)

قرآن کا سرچشمہ ہدایت ہونا مسلم لیکن شرح و تصوف، روایات و

خرافات کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں اس کی ضیاباریاں چشم بصیرت تو شاید دیکھ لے، لیکن عام انسانی آنکھیں ان سے بہرہ اندوز کیونکر ہوں، وجود مصطفوی کی حقیقت کفار مکہ کی نظروں سے اوجھل ہی رہی، جب تک کہ ایک ضرب کلیمی نے لات و ہبل کو ریزہ ریزہ نہیں کر دیا۔ اُن کے ٹوٹتے ہی نور حقیقت کی تجلیاں فضائے مکہ پر لمعہ افگن ہوئیں اور تب جاکر آنکھوں نے وجود مصطفوی کی حقیقت کو سمجھا۔ حقیقت اسلام کو بے نقاب کرنے کے لئے اقبال روایات اور خرافات کے لات و ہبل کو توڑنے کی دعوت دیتا ہے اور ان اصنام پر پہلی ضرب وہ خود لگاتا ہے ؎

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ۔۔۔ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

جہاں تمام صنم کدہ بن گیا ہے اور توحید کا جوش رکھنے والے بھی زنار پوش ہیں، اقبال کا نعرۂ لاالہ الا اللہ ضرب کلیمی کا کام کرتا ہے ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے ۔۔۔ صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

یہ کار ابراہیمی کے فرائض اقبال ادا کرتا ہے۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں ۔۔۔ مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اقبال کے اس نعرہ انقلاب نے مسلمانوں کی واقعی دنیا بدل دی ہے ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو ۔۔۔ لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

اس نے مسلمان کی خودی میں انقلاب پیدا کر دیا، اب "چار سو" کا بدلنا مشکل نہیں رہا ؎

تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا ۔۔۔ عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

اقبال کی یہ سب کوششیں "جذب مسلمانی" کی تجلیات کو بے نقاب کرنے میں صرف ہوئیں کیونکہ اصل "جذب مسلمانی" ہے۔ اس کے انقلاب سے

لاریب "شرعِ مسلمانی" بدلے گی اور بدل کر رہے گی ؎

اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی — ہے جذبِ مسلمانی سرِّ فلک الافلاک
اے رہروِ فرزانہ بے جذبِ مسلمانی — نے راہِ عمل پیدا نہ شاخِ یقین نمناک

اقبال نے دلوں میں "شاخِ یقین کی نمناکی" تو اپنے وجد آور اور زندگی بخش نغموں سے بہت کچھ پیدا کر دی، لیکن راہِ عمل کی مشکلات کو وہ ادھورا ہی چھوڑ گئے۔

ان کے چھ لیکچر جو اسلام کی حیاتِ عقلی کی تشکیلِ نو

(RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

پر انگریزی زبان میں ہیں، ان مشکلات کو سلجھانے کی طرف پہلا قدم ہے۔ کاش زندگی ان کو مہلت دیتی تو وہ اسلام کی حیاتِ شرعی کی تشکیل کی بھی طرح ڈالتے جاتے، یہ کام ان کے پیشِ نظر تھا، مواد فراہم کر لیا تھا، مصر سے اس موضوع پر تازہ ترین کتابیں بھی آ چکی تھیں، اکثر فرمایا کرتے کہ یہ کتاب شرع و فقہ کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دے گی۔

"جذبِ مسلمانی" کی سرِ فلک الافلاکی روح پیدا کرنے کا کام واقعی پورا ہو گیا لیکن "شرعِ مسلمانی" کی راہ بھی کچھ کم دشوار نہ تھی۔ اس سے پہلے تصوف نے ظاہر و باطن کے نام سے "شرعِ مسلمانی" کے مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش کی، ہوا یہ کہ نہ "شرعِ مسلمانی" رہی اور نہ "جذبِ مسلمانی" نہ ظاہر رہا نہ باطن ہاتھ آیا، ممکن تھا اقبال اس رازِ سربستہ کو بہتر طریق سے حل کرتا، وہ مشرق کے جنوں اور مغرب کی عقل حقائق پرست دونوں کا راز داں تھا۔

یہ باتیں نہ قلندر کی ہیں اور نہ حکیم کی، ان کو وہی سمجھ سکتا ہے جو

قلندر اور حکیم دونوں کا مجموعہ ہو سے

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

وہ اپنے کارواں کی آوازِ رحیل کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا، وہ جان گیا تھا کہ یہ آواز "جذبِ مسلمانی" کی منزل پر کہاں تک پہنچا سکتی ہے سے

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک　　جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

اِس حقیقت شناسی کے تاثرات وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ موت نے اُسے ان رموز سے پردہ اٹھانے کی فرصت نہ دی سے

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب　　سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

مقامِ عقل و عشق

پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقامِ عشق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

قدرت کبھی کبھی اپنی فیاضی سے افراد کو اس قدر مالا مال کر دیتی ہے کہ دیکھنے والوں کی عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ اس نے شاعرِ مشرق اقبال کو ایسی ہی دریا دلی کے ساتھ اپنی بہترین نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ آج شاعر اور شعر فہم اس بات پر مرثیہ خواں ہیں کہ شاعری کا سرتاج اِن میں سے رخصت ہو گیا جس نے اُردو اور فارسی شاعری کو ایک انوکھا سوز، ایک ایسی وسعت معنویت بخشی تھی کہ بجائے اونگھتوں کو سُلانے کے قوموں میں بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ سنئے اور اسی کے الفاظ میں سُنئے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معرکہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

فلسفی اور مفکر اس نکتہ رس دماغ کو یاد کرتے ہیں، جو علم و حکمت کی گتھیوں کو اپنی خداداد ذہانت سے سُلجھاتا تھا اور تقدیرِ انسانی کے سربستہ رازوں کی پردہ دری کرتا تھا۔

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی — گستاخ ہے فطرت کی کرتا ہے حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی — رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے — آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

صوفی اور مذہبی لوگ اس صاف باطن اور ولی صفت انسان کا ماتم کرتے ہیں جس کے دل میں عشقِ الٰہی کی بجلیاں آسودہ تھیں اور انسانوں کی محبت کا جلوہ روشن تھا۔

گرچہ گشت عمر من بے حاصل است — چیزکے دارم کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں — کز سم شبدیز تو دارد نشاں
بندۂ را کو نخواہد ساز و برگ — زندگانی بے حضور خواجہ مرگ
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر — دوستانش از غم او بے خبر
در بیاباں مثل چوب نیم سوز — کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز

ہندوستانیوں کو اس وسیع القلب جادو بیان شاعر کا غم ہے جو جھوٹی اور فساد پیدا کرنے والی قومیت سے بلند تھا، لیکن اس کے دل میں وطن کی محبت فروزاں تھی، جس نے انہیں ترانۂ ہندی سُنایا، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھا، ایک "نئے شوالے" کی دعا مانگی اور کبھی ٹیپو سلطان کی زبان سے، کبھی بھرتری ہری کے الفاظ میں، کبھی "شعاعِ امید" کے نام سے حُبِ وطن کے گیت گائے، کون ہے جو "شعاعِ اُمید" کے پرجوش اور پرسوز اشعار کو بھول سکتا ہے؟

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا صدف ریزۂ دُرِ ناب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواصِ معانی — جن کے لئے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے اب تشنۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

مسلمانوں کو اسلام کے اس سچے فدائی اور علم بردار کا رونا ہے جس نے اسلام کے رُخِ روشن سے اس گرد کو دور کیا جس نے اس کے حقیقی خدوخال کو چھپا رکھا تھا اور اس کو دوبارہ ایک حرکت اور زندگی بخشنے والی قوت بنا کر پیش کیا، جس نے مومن کامل کی یہ دلکش تصویر کھینچی :-

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگاہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

مذہب انسانیت کے ماننے والوں کو اس بلند خیال مفکر کا غم ہے جس نے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ سچی مذہبیت رواداری کا نام ہے اور ملک اور رنگ اور نسل کے وہ تمام رشتے جو انسانوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بناتے ہیں غلامی کی زنجیریں ہیں جن کا توڑنا انسان کا فرض ہے۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

اور اقبال کے بیشمار عقیدتمندوں اور دوستوں کو اس پاک باطن، نیک طینت، صاف گو، پر خلوص، متین و ظریف ذکی و ذہین کی یاد ستاتی ہے جس سے مل کر آدمی اس کا ہو جاتا تھا، جس کی باتیں دل میں گھر کر لیتی

تھیں، جس کے حکمت اور فلسفے کے نکتے جن میں ظرافت اور ندرت بیان کی چاشنی ایک عجیب لطف پیدا کر دیتی تھی، ان کی زندگی کی بہترین دولت تھے۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ ایک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

اور پھر اس کے دل کی وسعت اور صفا کو دیکھئے:۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد — مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو — یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد
فقیہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری — مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد
خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پرویز — خدا کی دین ہے سرمایہ غم فرہاد
کئے ہیں فاش رموز قلندری میں نے — کہ فکر مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

کوئی کیسے چند منٹ میں اس شخص کے بارے میں تقریر کر سکتا ہے جس میں اتنی حیثیتیں جمع تھیں، جس کا احترام اور عقیدت الفاظ کے راستے میں حائل ہے اور جس کی جدائی کا صدمہ ابھی اس قدر تازہ ہے کہ دل کے زخم کی طرح دکھتا ہے۔ بہر حال میں مختصر طور پر اقبال کے کلام اور فلسفہ کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جن کے میل جول نے ان کی شاعری میں وہ اثر اور اعجاز اور ہمہ گیری پیدا کر دی ہے، جس کا ایک زمانہ

معترف ہے۔ اس کی حیثیت مفکر کی تھی اور کیسا مفکر؟ "مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال" اور اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے فکر کے خزانوں کو شاعری کے قالب میں پیش کیا۔ حالانکہ شعر کے لئے یہ بار اٹھانا مشکل ہے۔
اس حکیم عصر نے مشرق کی افسردہ قوموں میں حیات تازہ پیدا کرنے کے لئے اپنے فلسفۂ خودی کو اپنے اثر آفریں انداز میں پیش کیا کہ ان کی منجمد رگوں میں خون حرکت کرنے لگا، غلط تصوف اور افلاطون کی کورانہ تقلید اور ملائی کے اثر نے اس کے شاعروں، ادیبوں، فلسفیوں، سب کو عمل سے بیزار اور دست کش بنا دیا تھا۔ اس نے انھیں از سر نو یہ سبق پڑھایا کہ انسان کی خلقت کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم بنائے اور اس کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرے۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زور خودی سے پربت پربت ضعف خودی سے رائی
ایک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں باقی ہے نمود سیمیائی!

اس نے افراد اور قوموں کو یہ سکھایا کہ قناعت اور رہبانیت کو چھوڑ کر اس عالم آب و گل میں جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے اور خودی کی تربیت اسی طرح ہو سکتی ہے۔

بدریا غلط و باموجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است

اس کشمکش اور جد و جہد کے بغیر اس کی خودی کی شمشیر آبدار نہیں بن سکتی نہ اس کی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں، نہ اس میں نظر پیدا ہوتی ہے۔ کبھی اقبال اس پیغام عمل کو کرم کتابی کی زبان سے سناتا ہے۔

شنیدم شبے در کتب خانۂ من
بہ پروانہ می گفت کرم کتابی
باوراق سینا نشیمن گرفتم
بسے دیدم از نسخۂ فاریابی
نفہمیدہ ام حکمت زندگی را
ہماں تیرہ روزم ز بے آفتابی
نکو گفت پروانۂ نیم سوزے
کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

کبھی وہ شاعر کو جسے مشرق کے پر شکستہ تخیل نے بید مجنوں کی طرح کمزور اور سرنگوں بنا دیا تھا زندگی کی کشمکش اور جد و جہد میں حصہ لینے کی تعلیم دیتا ہے۔

اے میاں کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی خود را بزن
مدتے غلطیدۂ اندر حریر
خو بہ کرپاس درشتے ہم بگیر
خویش را بر ریگ سوزاں ہم بزن
غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن
مثل بلبل ذوق شیون تا کجا
در چمن زاراں نشیمن تا کجا
اے ہما از یمن دامت ارجمند
آشیانے ساز بر کوہ بلند
تا شوی در خورد پیکار حیات
جسم و جانت سوزد از نار حیات

اقبال نے یہ بھی محسوس کیا کہ اقوامِ مشرق میں ضعف اور زوال اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں قومی خودداری اور خود شناسی نہیں رہی بلکہ انھوں نے مغرب کی گدائی اور غلامانہ تقلید اختیار کر لی ہے۔ کسی اور شاعر یا سیاسی لیڈر یا مفکر نے اس غلامانہ ذہنیت کے خلاف اس قدر جوش اور خلوص کے ساتھ آواز نہیں اٹھائی جس قدر اقبال نے۔ اگر کوئی زبان نثر میں ان مطالب کو ادا کرتا تو نہ معلوم اس کا کیا حشر ہوتا! اس کے نزدیک غلامی انسانیت اور اسلام کے سراسر منافی ہے۔

گرچہ دانا حال دل باکس نہ گفت | از تو دردِ خویش نتوانم نہفت
تا غلامم در غلامی زادہ ام | ز آستانِ کعبہ در افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفےٰ خوانم درود | از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر | سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ بو
از درودِ خود میالا نامِ او!

اپنی آخری مثنوی میں رسالت مآب کے حضور میں اپنی قوم کا حال عرض کرتے کرتے اس کو جوش آجاتا ہے اور وہ اس پست ذہنیت کے خلاف شکایت کرتا ہے جو اپنی آزادی اور خودداری کو دو کف جو کے عوض فروخت کرتا ہے :-

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ | ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر | آرزو در سینۂ او زود میر
ایں غلام ابن غلام ابن غلام | حریت اندیشۂ او را حرام
ایں زخود بیگانہ ایں مست فرنگ | نان جو می خواہد از دستِ فرنگ
نان خرید ایں فاقہ کش با جان پاک | داد ما را نالہ ہائے سوزناک

وہ انہیں اس سائلانہ ذہنیت کے خلاف تنبیہ کرتا ہے۔

از سوال آشفتہ اجزائے خودی | بے تجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر | از گدائی گدیہ گر نادار تر

اور انھیں سمجھاتا ہے کہ اپنی فطرت کے پوشیدہ خزانوں میں کان کنی کریں۔

دلا نارائی پروانہ تا کے | نگیری شیوۂ مردانہ تا کے؟
یکے خود را بسوز خویشتن سوز | طوافِ آتشے بیگانہ تا کے؟

وہ افراد اور اقوام میں الماس کی سی آبدار اور زبردست خودی پیدا کرنا چاہتا ہے :-

خوار گشتن از وجود خام خویش
سوختی از نرمی اندام خویش

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثل سنگ شو الماس باش

می شود از ہر دو عالم مستنیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است

یہاں تک تو "مقام عقل" کا ذکر تھا۔ اب ذرا سا حال "مقام عشق" کا بھی سن لیجئے جس میں یہ فرزانہ کھو یا گیا۔ اگر اقبال خودی کو محض قوت، دولت اور حکومت حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیتا تو اس کا درجہ مغرب کے ان مفکرین سے بلند نہ ہوتا جنھوں نے اہل یورپ کو بے روک اظہار خودی کی تعلیم دی ہے جس کی وجہ سے وہاں باہمی جنگوں اور سرمایہ داری کے مظالم کا وہ طوفان برپا ہے جس نے وہاں کے بہترین دماغوں کو مغربی تہذیب کے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا ہے۔ اقبال نے سائنس اور عقلیت کے اس بے مہار دور میں دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اگر محض عقل کو انسانی اعمال کی سرگردگی سپرد کی جائے، اس کا انجام بخیر نہ ہوگا۔ اس نے علم کے ساتھ عشق اور خبر کے ساتھ نظر کی حقیقت پر زور دیا اور بتایا کہ جب تک انسان اس عشق یا نظر یا دل یا وجدان کو اپنا راہبر نہیں بنائے گا وہ ہرگز خود غرضی خود پسندی، ظلم اور تصرف کے چکر سے نہیں نکلے گا۔ عقل مصلحت اندیش اور عشق خداداد میں کیا فرق ہے؟

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر
سود خود بیند نہ بیند سود غیر

وحی حق بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

اس لئے یہ عقل بغیر عشق کی راہنمائی کے انسان کے راستہ کو روشن نہیں کر سکتی:۔

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد — کہ میر قافلہ و ذوق رہزنی دارد
نشاں راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس — بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد

اور

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ رہ گذر کو کیا خبر ہے!

اور

اے لالۂ صحرائی تنہا نتوانی سوخت — ایں داغ جگر تابے بر سینۂ آدم زن
عقل است چراغ تو در راہ گذارے نہ — عشق است ایاغ تو با بندۂ محرم زن

اگر انسان کو اپنے نفس میں سچی انسانیت پیدا کرنی ہے، اگر اس کو سوز و تپش کی تلاش ہے۔ اگر اس کو خوف سے جو ہر قسم کی اخلاقی خرابیوں کا سرچشمہ ہے نجات حاصل کرنی ہے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے حریم دل میں شمع عشق کو روشن کرے کہ اس کے فیض سے انسان پر شرافت، خودداری، ایثار بلند حوصلگی کے غیر محدود امکانات کھل جاتے ہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

لیکن جب عقل "انسانی ادب خوردہ دل" ہو جاتی ہے، جب سائنس کی طبعی قوت اس کے تابع ہو جاتی ہے تو وہ انسان کے لئے سراسر باعث رحمت بن جاتی ہے، اس مضمون کو اقبال نے بار بار اور بہ ہزار جدت و رعنائی خیال ادا کیا ہے۔

عقلے کہ جہاں سوز دیک جلوۂ بیباکش — از عشق بیاموزد آئین جہاں تابی

اور

بگذر از عقل و بیاویز بموج یم عشق
کہ در ایں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

اور

نقشے کہ سینہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

اقبال نے مغربی تہذیب کی جو بے پناہ تنقید کی ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ مغرب نے محض عقل بے دین کی پرستش اختیار کر لی ہے اور عشق و نظر کو جو انسانیت کے بہترین جذبات کا ماخذ اور مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے مسترد کر دیا ہے، چنانچہ قوت اور دین کے بے تعلق ہو جانے سے سائنس انسان کے لئے غضب الٰہی بن گئی ہے۔ اس نے دور حاضر کے انسان کا نقشہ ان چبھتے ہوئے الفاظ میں کھینچا ہے۔

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورت مار
عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

انسانیت کے اس علم بردار نے اپنی شاعری اور تعلیم کا مقصد اعلیٰ یہی قرار دیا تھا کہ اس رجحان کے خلاف جہاد کرے جس میں تہذیب انسانی کی تباہی کے جراثیم پوشیدہ ہیں۔ اپنی آخری مثنوی کے پیش لفظ میں وہ خوانندۂ کتاب کو مخاطب کر کے اس عقیدہ کا اعلان کیا ہے۔

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

زمانہ ہیچ ندارد حقیقت او را
جنوں قباست کہ موزوں بہ قامت خرد است

بآں مقام رسیدم چوں در برم کردم
طواف بام و در من سعادت خرد است

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزان نیست | نگاہ بندۂ مومن قیامت خرد است

پھر کیوں نہ سحر اور اعجاز ہو اس شاعر کے کلام میں جس نے عقل کی قامت پر جنوں کی قبا کو موزوں کر کے دکھا دیا ہو، جس نے فلسفہ کی گہری حقیقتوں کو شاعری کے نازک اور حسین قالب میں ڈال کر پیش کیا ہو، جس کے خیالات میں زندگی اور حرکت ہو اور کلام میں شیرینی اور ترنم، جس کے جوش و خروش کا مقابلہ صرف اس کی تپش اور خلوص ہی کر سکیں، جس کے سینہ میں تمام عالمِ انسانیت کا دل دھڑکتا ہو۔ اسی دلِ حساس و عشق آشنا کا فیض تھا، جس نے اقبال کو اس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر بنا دیا۔ اس کی تائید بھرتری ہری کے الفاظ میں سُن لیجئے۔ یہ ہند قدیم کا ایک مشہور حکیم اور فلسفی تھا۔ جاوید نامہ میں شاعر جس کا خطاب 'زندہ رود' ہے، شش افلاک کی سیر کرتا ہوا فلک آخر پر پہنچتا ہے اور بھرتری ہری کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرتا ہے:۔

اے کہ گفتی نکتہ ہائے دل نواز | مشرق از گفتارِ تو دانائے راز
شعر را سوز از کجا آید بگو | از خودی یا از خدا آید بگو

بھرتری ہری کا جواب سُنئے اور اقبال کی تاثیر کا بھید پہچانئے۔

کس نداند در جہاں شاعر کجاست | پردۂ او از بم و زیرِ نوا است
آں دلِ گرمے کہ دارد در کنار | پیشِ یزداں ہم نمی گیرد قرار
جانِ ما را لذت اندر جستجوست | شعر را سوز از مقامِ آرزوست
اے تو اے تاک سخن مست مدام | گر ترا آید میسر ایں مقام
با دو بیتے در جہانِ سنگ و خشت | میتواں بردن دل از حور و بہشت

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال | مقامِ عشق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

اقبال کا فلسفۂ زندگی و عمل

ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری ۔ ایم ۔ اے پی ایچ ڈی

ا۔ زندگی اور شعر

اقبال زندگی کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ زندگی کی طرح اس کے خیالات اور تخیلات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ زندگی کی طرح اس کی شاعری میں جوش، شدت اور نمود موجود ہے۔ ہماری گذشتہ ربع صدی کی قومی زندگی کا ایسا کونسا دور ہے۔ جس کی ترجمانی اقبال نے نہیں کی، اور اس پر عظیم الشان شخصیت کی مہر ثبت نہیں کر دی ہے۔ اس نے ہندوستانی قومیت کی ترجمانی کی، فطرت کا ہمنوا ہو کر اس کے گیت گائے اور بالآخر اسلام اور انسانیت کی محبت میں گم ہو کر وہ تحریک انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہو گیا۔ زندگی کی طرح اقبال کا تصور زندگی اور اس کی شاعری بھی حیات سے لبریز ہے۔ وہ ساکت وجامد نہیں، بلکہ زندہ اور متحرک ہے۔ شاعری اقبال کے لئے بالذات کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب تک کہ وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے لئے ممد نہ ہو۔ وہ آرٹ صرف آرٹ کی خاطر کے نظریہ کو کبھی بھی تسلیم نہیں کرتا نفس انسانی کے شعبے اس کے یہاں علیحدہ علیحدہ وجود نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور وہ ایک ہمہ گیر مقصد اور نظام کے تحت میں کام کرتے ہیں۔

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال کی شاعری کی بنیادیں چند فلسفیانہ خیالات ہیں۔ فلسفہ صرف محدود معانی میں نہیں، جس کا منتہائے نظر صرف عقلی موشگافیاں ہوں یا زیادہ سے زیادہ عقل کے ذریعہ کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش، بلکہ وہ فلسفہ جس کا مقصد زندگی کی ترجمانی ہو، جو انسان یا قوم کے زندہ اعمال کا نتیجہ ہو۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا — غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں — وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلہ کو شرر سے
جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل — قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار — جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

ایسی صورت میں فلسفہ صرف فلسفہ نہیں رہتا بلکہ وہ ایک پیغامِ زندگی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کے لئے اس کی شاعری ایک پیغامِ زندگی ہے جو وہ انسانیت کو دینا چاہتا ہے۔

۲۔ تصورِ خودی

اقبال کا سب سے بڑا پیغام انسانیت کو یہ ہے کہ وہ اپنی "خودی" کی تربیت کرے۔ اس کی تمام شاعری اور فلسفہ کی بنیاد بھی خودی کا تصور ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانہ میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

خودی کی تربیت کے باعث تمام کائنات مسخر ہو جاتی ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہوگئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و براق
اس کی نگہ شوق پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اقبالؔ کے تمام خیالات اور اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے خودی کے اس تصور کو واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے۔ اقبالؔ مولانا رومیؔ کی طرح ارتقا کا قائل ہے۔ اسے اس کا یقین ہے کہ جمادات، نباتات اور حیوانات کی منازل طے کرتا ہوا انسان اپنے موجودہ انسانیت کے درجہ پر پہنچا ہے اور اس کے بعد وہ آئندہ ترقی کرکے ملکوتی مدارج تک پہنچ جائے گا۔ اس نظریہ کے مطابق، انسان حیوانات اور ملکوتیت کا ایک مجموعہ ہے۔ خودی انسان کا ازلی و ابدی عنصر ہے، اس لئے لازماً وہ حیوانی عنصر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حیوانی عنصر فنا ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا حیوانی یا مادی پہلو صرف اس کے روحانی پہلو کے اظہار کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ بقول غالبؔ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

یہ ملکوتی پہلو انسان کا روحانی پہلو ہے، یہ انسانی زندگی میں ایزدی ازلی و ابدی عنصر ہے، یہی دراصل انسان کی "خودی" ہے، جس کی تربیت انسانی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔ .... جب اپنے اس اصل مرکز سے انسان دور ہو جاتا ہے تو وہ حیوانیت کے قعر مذلت

میں جاکر ڈوب جاتا ہے، لیکن جب وہ اس کی تربیت کرتا ہے تو مادی وروحانی ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اقوام اس سرچشمہ سے واسطہ ترک کر دیتی ہیں تو مادی اور روحانی اعتبار سے غلام ہو جاتی ہیں لیکن جب وہ اپنا رشتہ اس سے برقرار رکھتی ہیں تو دنیا پر خدائی کرنے لگتی ہیں۔ یہی دراصل انسانی اور قومی زندگی کا مرکز ہے۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی
اس دور میں بھی مرد خدا کو ہے میسر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی

اقبال کا فلسفہ دراصل اسلامی فلسفۂ اخلاق کے بنیادی اصول "تخلقو باخلاق اللہ" کی تفسیر ہے۔ چونکہ انسان کی اصل ایزدی ہے اس لئے الٰہی ایزدی عناصر کی نشو و نما و تربیت انسانی زندگی کا سب سے بڑا اخلاقی و مذہبی فریضہ ہے۔ خدا چونکہ رحیم، رحمٰن، قہار، ہادی اور رب ہے اسی لئے اس قسم کی خوبیاں پیدا کرنا انسانی زندگی کا بھی منتہائے کمال ہے۔ ان اخلاقی خوبیوں کے حامل مردِ مسلماں کی تصویر کس خوبی سے پیش کی ہے:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ الرحمٰن

بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

نفس انسانی میں یہ ایزدی صلاحتیں امکانی طور پر موجود ہیں۔ ان کی نشو و نما و تربیت پوری کائنات کر رہی ہے، اور انسان کو بھی اس کام کو انجام دینا چاہیئے۔

اس خودی کا وجود صرف افراد ہی میں نہیں بلکہ اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور ہر قوم ایک مخصوص خودی کی قائل ہوتی ہے، چنانچہ اسلام کی خودی کی اقبال اس طرح تشریح کرتا ہے :-

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصلِ نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

قومی خودی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز غلامی ہے، جس کے باعث قوم کے تمام اعلیٰ نفسی خصائص فنا ہو جاتے ہیں، وہ انسانوں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح زندگی گذارنا شروع کر دیتی ہے۔ اس میں وہ تمام رزائل پیدا ہو جاتے ہیں جو لازماً غلامی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اقوام کی غلامی کے خلاف شاعرِ زندگی سب سے زیادہ آواز بلند کرتا ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

غلامی کی نفسیات کو اقبال اس طرح بیان کرتا ہے :-

سخت باریک ہیں امراضِ امم کے اسباب
کھول کر کہئے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شبیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ رو باہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

۳۔ انسانیت کی خودی

اقوام کی خودی کی طرح انسانیت کی بھی اپنی ایک خودی ہے۔ اس خودی کی ہمہ گیر تربیت کا تصوّر رسول اللہ صلعم نے پیش کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ رنگ و نسل، قبائل و اقوام کے بتوں کو پاش پاش کر کے انسانیت کا ایک جامع، بلند و ہمہ گیر نصب العین انسانوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اقبال اس نصب العین کا حامل ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ کس طرح اس نصب العین کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں تو اس کا دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور اس کا حساس دل آہ و بکا کرتا ہے۔ اسی صدمہ سے متاثر ہو کر وہ آج کل کے اجتماعی اداروں پر سخت تنقید کرتا ہے اور انسانیت کو دوبارہ اخوت و محبت کا سبق دینا چاہتا ہے۔ دورِ حاضر کے متعلق کہتا ہے۔

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں باقی رہتی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

جمعیتہ اقوام جو دنیا میں امن و مساوات قائم کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی اور جس سے انسانوں کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں کس قدر ناکام ثابت ہوئی ہے، اس کا اظہار اقبال اس طرح کرتے ہیں۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ اور سنبھل جائے

اقبال کو نہ جمعیتہ الاقوام سے اور نہ یورپ کے جدید تہذیب و تمدن سے انسانیت کے لئے کوئی امید ہے کیونکہ اس کی بنیاد حرص و آز، مکر دفن اور قوت کے جذبہ پر مبنی ہے۔ وہ انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کو ہضم کر لینا چاہتی ہے۔ اس سیاست میں یہ تمام خرابیاں اس لئے پیدا ہو گئی ہیں کہ اس کی بنیادیں روحانیت کی بجائے مادیت پر قائم ہیں جو انسانی نظر کو محدود کر دیتی ہے۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاع غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسیا کے سفیر

اس شہنشاہیت اور لوٹ و غارتگری سے نجات پانے کا واحد ذریعہ اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ تہذیب مشرقی کا دوبارہ احیا کیا جائے جس کی بنیادیں روحانیت پر ایستادہ ہوں۔ اس تہذیب مشرقی کا سب سے بڑا علمبردار اقبال مسلمانوں کو سمجھتا ہے کیونکہ ان کی تعلیمات نظری اعتبار سے سب سے زائد جامع ہیں۔ اس میں علم و عمل روحانیت اور مادیت کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے، اور ان اقوام میں اب تک اپنی آزادی کے باعث احساس خودی بھی باقی ہے۔ چنانچہ وہ جمعیتہ اقوام مشرق کا خیال پیش کرتا ہے اور جینوا کی بجائے طہران سے دنیا کی قسمت وابستہ کرنا چاہتا ہے۔

طہران ہو اگر عالم مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اس طرح مسلم قوم امن و امان کی طرف دنیا کی رہنمائی کرے گی۔ اس کے عناصر زندگی کیا ہیں؟ ان کو اقبال نہایت حسن و لطافت سے بیان

کرتا ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب — یگانہ اور مثالِ زمانہ — گوناگوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

غرضکہ مسلم قوم کو جو انسانیت کی خودی کی حامل ہے، اقبال دنیا کا امام دیکھنا چاہتا ہے جو یہاں سے ظلم و شہنشاہیت کے تمام مصائب کو دور کر دے اور یہاں حقیقی معنوں میں خلافت اللہ قائم ہو جائے۔

۴۔ کائنات کی خودی یا خدا

افراد، اقوام اور انسانیت کی طرح بحیثیت مجموعی کل کائنات کی بھی ایک خودی ہے۔ کائنات کی اس خودی کو مذہبی اصطلاح میں خدا کہا جاتا ہے۔ یہ خودی کائنات کے ہر ذرّہ میں جاری و ساری ہے۔ یہ کائنات کا روحانی فعال عنصر ہے، اپنے اظہار کے لئے اس روحانی عنصر نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ بقول غالبؔ

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

حُسن کی خود بینی کے باعث کائنات میں مظاہرِ حسن وجود میں آتے ہیں۔ جس طرح افراد و اقوام میں نشو و نما کی صلاحیت موجود ہے، اسی طرح کائنات کی خودی میں بھی یہ استعداد ہے۔ بیشک یہ صلاحیت و استعداد کا تصور افراد و اقوام کی محدود صلاحیتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ محدود ہے، لیکن وہ

اس کا ادراک نفس انسانی، تاریخ اور فطرت کے مطالعہ کے ذریعہ کر سکتی ہے۔ مَن عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ میں ایک بڑی گہری حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہ اقوام و ملل کے انقلابات ہمیں اس ایزدی عنصر کی کارفرمائیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ فطرت کا ہر مظہر بھی اس کا آئینہ بردار ہے۔

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

خدا کا تصور اقبال کے یہاں جامد نہیں ہے بلکہ نامی ہے۔ اس کا خدا ارسطو کا کا سا خدا نہیں ہے جس نے کائنات کو پیدا کر دیا ہے اور اب پر سکون و خاموش ہے۔ اقبال کا خدا ہنگاموں اور شورشوں سے لبریز ہے۔ وہ اپنی امکانی صلاحیتوں کا اظہار جمادات، نباتات، حیوانات انسانوں اور ملائک کے ذریعہ ہر لمحہ کئے چلا جا رہا ہے۔ وہ کائنات کے ہر ذرہ کا نامی، فعال روحانی عنصر ہے۔ وہ اپنی ترقی کی نشو و نما کے لئے مادہ کو استعمال کرتا ہے۔ جب وہ ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پہلا مادہ بیکار ہو جاتا ہے اور دوسری قسم کا مادہ تخلیق کر لیتا ہے جس قدر روحانی ارتقا بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر اس کے اظہار کے لئے مادہ بھی لطیف ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا ترقی ونشو و نما کے امکانات لامحدود ہیں، جن کا نہ احصا کیا جا سکتا ہے اور نہ تصوّر۔ ارتقا کی اُن تمام منازل پر عقل راہ نمائی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ عقل ایک محدود چیز ہے، زندگی کی راہ نمائی عشق کرتا ہے۔ عشق کے ذریعہ مکمل زندگی کا اظہار ہوتا ہے، وہ عقلی، جمالی اور مذہبی عناصر سے مرکب اور اس پر حاوی عمل ہے ہے

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات　　　علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق غرضکہ وہ عمل ہے جس کے ذریعہ کائنات کا اظہار ہو رہا ہے، اس لئے عمل ہی اصل کائنات ہے۔ اقبال کا مکمل فلسفۂ زندگی غرضکہ تصورِ عمل پر مبنی ہے۔ وہ ثبوتی تصوف کا تو قائل ہے مگر اس نفی تصوف کا جو انسان کو اپاہج کر دے، وہ سخت مخالف ہے۔ وہ تو مستیٔ کردار چاہتا ہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　　مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق　　　افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

عمل کے ذریعہ انسان اور کل کائنات ارتقا کی انتہائی بلندیوں کی طرف جا رہی ہے۔ زندگی کے پرجوش امڈتے ہوئے دریا برابر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خودی

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی　　　ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

طے کرتی ہوئی اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں بجز لاالہ الا اللہ کچھ نہیں ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لاالہ الا اللہ　　　خودی ہے تیغ فساں لاالہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے　　　صنم کدہ ہے جہاں لاالہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا　　　فریبِ سود و زیاں لاالہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند　　　بتانِ وہم و گماں لاالہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری　　　نہ ہے زماں نہ مکاں لاالہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند　　　بہار ہو کہ خزاں لاالہ الا اللہ

اقبال کی تعلیم

محمد عرفان خاں ندوی متعلم بی اے جامعہ

مسلمانوں کی گذشتہ دونوں قسم کی فتوحات جو انھوں نے میدان کارزار اور میدان علم میں حاصل کی تھیں، وہ حقیقتاً عدیم النظیر تھیں۔ پھر نہ تو معرکہ کارزار ہی میں کوئی ایسا مرد مجاہد نکلا جس کے بہادرانہ عزم و ثبات اور سچے خلوص و ایثار نے مادی ذرائع و وسائل سے قطعاً بے نیاز ہو کر صرف اپنے عزم و ثبات اور خلوص و ایثار کے بل بوتہ پر میدان جہاد میں کامیابی و نصرت حاصل کر کے صداقت اور دیانت کا علم لہرا دیا ہو، اور نہ پھر علمی میدان میں کوئی ایسا صاحب علم بزرگ پیدا ہوا جو اپنے علم کی روشنی اور تقوے کی شعاعوں سے جہالت اور اوہام کا پردہ چاک کر کے رکھ دیتا اور دنیا پھر ایک بار اصل علم اور حقیقی تقوے کی روشنی سے منور ہو جاتی!

مکتب، مدرسے، درسگاہیں، کالج اور یونیورسٹیاں آج بھی موجود ہیں، اور اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کا عدد شمار ہی حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ ان کی تعداد بھی جو طلب علم میں مصروف ہیں، کچھ مایوس کن نظر نہ آئے گی۔ لیکن اس علم کے چرچے کے باوجود بھی علم جس چیز کا نام ہے، وہ اب گویا مسلمان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے۔ پکار علم علم کی سنائی دے گی اور اشاعت جہالت

کی ہوگی۔ علم بجائے دانائی وفراست حکمت وبصیرت عطا کرنے کے آنکھوں کی بینائی، دل کی بصیرت اور دماغ کی فطری صلاحیتوں کو بھی سلب کرلے گا۔ اگر وہ کچھ عطا کرے گا تو بس بے صبری اور مذہبی تقلید اور جب حالت یہ ہو تو نوعِ انسانی کی متاعِ عزیز جو حیوان اور انسان میں ما بہ الامتیاز ہے، جس سے انسان انسان کہلانے کا مستحق ہے یعنی خودی اور خودداری کی نشو ونما، تو پھر اس کی توامید اور توقع ہی فضول ہے۔ علّامہ اقبال ہندی مکتب کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ؎

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

طالب علم کا زندگی میں موت کا سا سکون، اس کی اندھی اور کوری تقلید اور اس کی بے بصری اقبال کو ایک آنکھ نہیں بھاتی، اور وہ طالب علم کے لئے بارگاہِ خداوندی میں دعا کرتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

مدرسہ اور اس میں مدرسین کے مشاغل ـــ کتاب اور صرف اس کے مباحث کی تفسیر وتشریح کردینے سے کیا ہوتا ہے؟ کیا دانش وبینش کا کمال یہی ہے کہ اساتذہ محض راوی بن کر صرف روایتوں کو دوسروں تک پہنچانے کی خدمت اپنے ذمہ لے لیں؟

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار — کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ ودو
کرسکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت — وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

مدرسوں میں تعلیم کی غرض ظاہر ہے کہ آج کل حصول معاش ہی بنائی گئی ہے۔

یہ عصر حاضر نے ایک نیا تحفہ ہماری درسگاہوں کو عطا کیا ہے۔ اگلے لوگوں پر بھی ظاہر ہے کہ کہیں سے من و سلویٰ نہیں اترتا تھا، وہ بھی فکر معاش کرکے اپنی روزی حاصل کرتے تھے، پھر کیا اب آسمان بدل گیا یا زمین وہ نہیں رہی کہ ہر فرد بشر باعزت طریقہ پر اپنی معاش حاصل کر سکے؟ یا پھر رزق کے دروازے کسی خاص حکم خداوندی سے مسدود کر دیئے گئے ہیں اور یوں یہ حیرانی و سراسیمگی رونما ہے؟ مدرسہ بجائے اس کے کہ طالب علم کو کشمکش حیات کے حل کرنے کی تدبیریں بتلاتا، مصائب و تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے سبق پڑھاتا، فطری خاموش سوتوں کو حرکت دے کر ان سے چشمے بہاتا، فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرتا، غیر فطری کدورتوں کو دل سے دھو دیتا، نظر کو وسیع کرتا، بصیرت زیادہ کرتا اور دماغ کو کشادگی بخشتا۔ کیا تو یہ کیا کہ کشمکش حیات کے تصور سے ہی کلیجہ منھ کو آنے لگا، مصائب و تکالیف کا خیال ہی دل کو ستانے لگا۔ فطری صلاحیتوں پر میل کچیل کا ایسا ردّا جما یا کہ اُن کی اصلی چمک دمک ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی، بصارت نے جواب دے دیا اور فطرت کے اسرار و رموز جو ہر دیدۂ بینا کے لئے ہیں اس کے لئے بالکل مسدود ہو کر رہ گئے۔ مدرسہ کے عنوان سے علامہ اقبال ضرب کلیم میں فرماتے ہیں ؎

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

آخر میں فرماتے ہیں ؎

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اقبال مدرسہ اور تعلیم گاہ کی قدر و منزلت سے خوب واقف ہیں، اور وہ اس سے بھی اچھی طرح باخبر ہیں کہ اگر مدرسے واقعی مدرسے اور تعلیم گاہیں حقیقی معنی میں تعلیم گاہیں ہوں تو ان سے کون کون سے کام لئے جا سکتے ہیں، اور درسگاہیں روحِ انسانی کی تہذیب میں کیا کچھ خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ اُن کو تو جو کچھ غصہ آتا ہے اور وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتے ہیں، وہ صرف اس بات پر کہ خداوند کریم کے عطا کردہ عطیہ عقل و خرد کو کیوں نہ کام میں لایا جائے۔ اور دانش و بینش کو معطل کر کے آدمی کیوں بے صبری اور اندھی تقلید کا مطعون بنے۔ یہ بے صبری حقیقتاً سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے، اور یہی نوجوانوں کی بے صبری، اقبال کو لہو رُلاتی ہے، اور اُس نے اپنے دل و دماغ کا بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالا ہے کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے۔

مدرسہ اور درسگاہ کے ماحول کو اتنا کچھ بُرا بھلا کہہ کر پھر اقبال چاہتے ہیں کہ ایک بار تو اور نصیحت کر ہی دیں، شاید کوئی مردِ مومن اُسے گوشِ شنوا سے سُنے اور اس پر کاربند ہو کر مدرسہ کے ماحول میں حیاتِ تازہ پھونک دے۔

جس طرح کہ سلطنت میں رعایا کی صلاح و فلاح کا ذمہ دار بادشاہ اور راعی قرار پاتا ہے اسی طرح مکتب پر شیخِ مکتب کی بادشاہت ہوتی ہے۔ رعایا اپنی اولاد کو شیخ کی نگرانی میں دے کر اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو گئی، اب ان ملائم اور اثر پذیر طبیعتوں کو اقبال کے آئیڈل سانچہ میں ڈھالنا جس کو وہ روحِ انسانی کی "صنعت گری" سے

تعبیر کرتے ہیں، اُس "عمارت گر" کا کام ہے جس کا دوسرا نام شیخ مکتب ہے۔ امام اگر امامت کے فرائض و خدمات سے واقف ہے اور اہلیت و صلاحیت کے ساتھ فرائض امامت انجام دے رہا ہے تو مقتدی بھی نہ تو گمراہ ہو سکتے اور نہ بھٹک سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر "شیخ کامل" ہے تو شاگرد دل کا بھی "ناقص" رہ جانا محال ہے۔ علامہ اقبال کی یہاں بھی یہی نصیحت ہے کہ عقل و خرد، بصارت و بصیرت، اور دانش و بینش کے سامنے اوٹ نہ کی جائے۔ جہاں اوٹ کی گئی اندھیر الگھپ چھایا اور پھر —— ظلمت، تاریکی اور ضلالت کا بے تھاہ سمندر، اور جہاں اوٹ ہٹی، خورشید عقل کی تابناکی سے کائنات کا ایک ایک گوشہ اور آفاق کا ایک ایک ذرہ جگمگا اٹھا اور پھر دیکھو تو —— نور ہی نور، روشنی ہی روشنی اور ہدایت کی ضیا باری۔ اب علامہ اقبال کی زبان سے سُنئے، بال جبریل میں شیخ مکتب کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتۂ دل پذیر ترے لئے — کہہ گیا ہے حکیم قاآنی

"پیش خورشید بر مکش دیوار
خواہی ار صحن خانہ نورانی"

ایسی صورت میں جب کہ تحقیق کی جستجو نہ ہو اور آزادئ فکر و ضمیر بھی ہمدم نہ ہو تو پھر ہر کسی صیاد کے چنگل میں پھنس جانا بالکل آسان ہے۔ پنجابی مسلمان کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد

کہا جائے گا کہ عصر حاضر کی یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں تو آزادئ فکر اور روشن ضمیری کی کمی نہیں، لیکن یہاں "آزادئ فکر" اور "روشن ضمیری" کے معنی یہ لئے گئے ہیں کہ ہر پرانی چیز سے بلا غور و تدبر انکار کیا جائے اور ہر نئی چیز پر ایمان بالغیب لایا جائے، بغیر اس کو جانچے ہوئے اور بلا اُس کو دیکھے اور پرکھے ہوئے۔ اِدھر "پرانی اور فرسودہ" چیزوں، خدا اور رسولؐ سے (نعوذ باللہ) انکار ہوا اور اُدھر لینن اور اسٹالن کے سامنے سر نیاز جھک گیا۔ غرض اس گردن کو سرفرازی اور سربلندی کسی صورت میں بھی میسر نہیں ہے۔ عصر حاضر کے مدرسہ کے متعلق سُنئے ؎

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

پھر اس طرح کی آزادئ فکر اور روشن ضمیری کے نتیجہ میں عصر حاضر کی تعلیم گاہوں سے نوجوانوں کو کون کون سی برکتیں حاصل ہوتی ہیں ؎

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

علامہ اقبالؔ کے نزدیک آزادئ افکار کے برتنے کا سلیقہ چاہیئے اور بے سلیقہ اگر آزادئ افکار قوم نے اختیار کی تو یہ تباہی و بربادی کے لچھن ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آزادئ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

علامہ اقبالؔ نوجوانوں سے بے صبری اور اندھی تقلید دور کر کے ان کو غور و تدبر کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوجوان فکر و تامل کرنے کے عادی بن جائیں۔ اگر یہ متاعِ گم گشتہ حاصل ہو گئی تو یہ ان کے نزدیک ان تمام دردوں کا مداوا بن سکتی ہے جو اس وقت مسلم

قوم کے بدن اور روح کے لئے مستقل روگ بنے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبالؔ چونکہ تعلیمات اسلامی اور دیگر تمام ادیان کی تعلیمات کا نہایت ہی وسیع اور گہرا مطالعہ کر چکے ہیں اور انھوں نے کامل غور و خوض اور فکر و تامل کے بعد اسلامی تعلیمات کو امت مسلمہ کی احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے لئے تریاق قرار دے لیا ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ نوجوانان قوم بھی کسی کی تقلید میں نہیں بلکہ اپنی عقل کی روشنی میں تعلیمات اسلامی پر تدبر کر کے صراط مستقیم پالیں۔ ان کو اس بات پر پورا یقین ہے کہ عقل و تدبر کی کسوٹی پر اگر کوئی چیز پوری اُتر سکتی ہے تو مذہب اسلام اور اس کی الہامی تعلیمات ہی ہیں۔ دوسری تعلیمات عقل و تدبر کے ایک ہی جھونکے کے آگے خس و خاشاک کی طرح تتر بتر ہو جائیں گی۔

علامہ اقبالؔ نے مذہب اسلام کا خوب گہرا مطالعہ کیا ہے، اور اس کے حقائق و معارف، اسرار و رموز ایک ایک کر کے ان پر خوب منکشف ہو چکے ہیں۔ اسلام کی اصلی تعلیمات پر وہ دل و جان سے فدا ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کی شاعری روح اسلام کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرتی ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا تخیل وہ نہیں ہے جو "ملاؤں" اور "پیروں" نے سمجھ رکھا ہے، وہ توحید کے قائل ہیں، خداوند تعالیٰ کے فرد اور قادر مطلق ہونے کا پکا ایمان رکھتے ہیں، اسی لئے وہ ماسوا سے بے نیاز ہیں، لیکن نہ ہماری طرح کہ ایک طرف زبان سے تو ہم اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن ہمارے اعمال سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ کتنے ایمان اور یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے   ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ سجدہ کس کے آستانہ پر ــــ اس قادرِ مطلق کے آستانے پر جس کے اختیارِ مطلق سے دُنیا کی کوئی چیز باہر نہیں. پھر جب اس پر آدمی کو پورا یقین اور پکا اعتقاد ہو تو ماسوا کی طرف توجہ کرنا کیسا، اور غیر اللہ کی طرف التفات کیوں؟ اور ایسی صورت میں کیا توحید کا عقیدہ اپنی جگہ پر باقی رہ سکتا ہے؟ علامہ اقبال کو اس صورت حال پر تعجب ہے اور وہ انتہائی تعجب کی حالت میں پوچھتے ہیں سہ

آہ! اے مردِ مسلمان تجھے کیا یاد نہیں ۔۔۔ حرفؔ لَا تَدعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً آخر"

علمی مسئلہ کی حیثیت سے جہاں تک توحید کی بحث کا تعلق ہے آپ کو علم کلام کی کتابیں اس سے پر ملیں گی اور قاطع دلائل و براہین سے وحدتِ وجود کو ثابت کیا جائے گا، اور اس سے پیدا کردہ ضمنی مسئلوں یعنی "خدا کی رویت" "خدا کا اپنا مثل پیدا کرنے پر قدرت" "خدا کے (نعوذ باللہ) جھوٹ بولنے پر امکان" ان تمام "مہتم بالشان" مسئلوں پر خوب بحثا بحثی ہو گی، لیکن توحید کے عقیدے سے جو ثمرات اور نتائج مرتب ہونے چاہئیں تھے، اور جس عقیدے کی تعلیم نے اگلوں کے تن بے جاں میں نئی زندگی اور نئی روح پھونک کر ان کو دنیا سے بے نیاز بنایا اور وحدت افکار اور وحدتِ کردار کا وہ نادر نمونہ پیش کیا جس کے سامنے دنیا کی متحدہ طاقتیں ہیچ اور ناکارہ ثابت ہوئیں۔ اب اس پُرانے عقیدے سے ان ثمرات کی امید اور توقع ہی فضول ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں سہ

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی ۔۔۔ آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو ۔۔۔ خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

ہمیں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

یعنی جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے سب توحید کے قائل ہیں، لیکن جہاں کردار کا سوال آیا پھر دیکھئے کہ نئی نئی قسم اور بھانت بھانت کے جانور آپ کو دکھائی دیں گے۔ اگر ایک مشرق کو اپنا قبلہ مقصود ٹھہرائیگا تو دوسرا مغرب کو منتہائے مقصود قرار دے گا۔ ایک شمال کا رُخ کرے گا تو دوسرا اس کو بیٹھ دکھا کر جنوب کی جانب کوچ کرتا نظر آئے گا۔ جب تک کردار اور اعمال میں یکسانی، ہمرنگی اور مطابقت نہ ہو اس وقت تک "وحدت افکار" کو لے کر کوئی کیا کرے ع

وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

نماز کا فلسفہ کیا ہے؟ یہی نا کہ وحدت افکار و کردار کا سبق مقتدیوں کو سکھایا جائے! ارکان نماز میں سے ہر رکن کی حقیقی روح اس جذبہ کا پیدا کرنا ہے۔ کیا ایک خاص وقت میں ایک مخصوص جگہ پر جمع ہو کر قیام، قرأت، رکوع، سجود ہی مقصود بالذات ہے؟ یا اس سے مراد دراصل یہ ہے کہ تمام مسلمان حقیقتاً ایک جسم اور ایک روح رکھتے ہیں اور اس پورے جسم کی تکمیل امام کے ہاتھ میں ہے، وہ اس پوری جماعت کا ہادی اور رہنما ہے اور یہ پورا گروہ اس کا مقتدی اور پیرو۔ لیکن صد افسوس کہ نماز کی اس حقیقت سے اب کون باخبر ہے؟ علامہ اقبالؒ اس بے خبری پر جھنجھلاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اس طرح نماز کا فلسفہ بتا کر اس سے ایک ایسی قوم و ملت کی تشکیل مقصود ہے جو ہزار صد ہزار قالب لیکن یک دل و یک جان ہوں ایک کا درد تمام

جماعت کو درد میں مبتلا کر دے، اور ایک کی مسرت تمام جماعت کو مسرور و خوش بنا دے۔ علامہ اقبالؔ توحید کے عقیدے اور نماز کی ادائیگی سے تمام عالم اسلام کو ایسی ہی جماعت میں منظم کرنا چاہتے ہیں۔ اصل توحید کے عقیدے اور سچی نماز کی ادائیگی میں وہ عالم اسلام کی یکجہتی اور اتحاد کی بنیادیں مستحکم اور استوار پاتے ہیں۔

مگر اس ریاکاری کا برا ہو جو آج ہر چیز پر حاوی ہے۔ مذہب اُس کے حملہ سے نہ بچ سکا، اور مذہبی رسوم اپنی حقیقی اور اصلی روح کھو کر محض نمائشی کھلونے بن گئیں، جن سے مقصود بالذات شکم پروری اور اپنے تقدس کا ڈھنڈورا پیٹنا قرار پایا۔ نماز ریاضت کے خلوص سے خالی ہو کر محض ورزش جسمانی بن چکی ہے، جس سے روح کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملائے حرم سے خطاب کر کے فرماتے ہیں ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال　　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

اسلام کی روح کیا ہے؟ اُن کا یہ اسلامی فلسفہ کیونکر سب سے الگ تھلگ اور ممتاز ہے، ان ہی کی زبان سے سُنئے ؎

روح اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی　　زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصل نمود　　گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر　　دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

علامہ اقبالؔ کا فلسفہ خودی ہر جگہ حاوی ہے، اور یہی اقبالؔ کے احساسات و جذبات، تخیلات اور تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اس میں عالم اسلام کے مرض کا علاج موجود ہے، اور حقیقتاً اِس اکسیر سے امت مسلمہ مرحومہ

کا احیار کچھ مشکل نہیں. علامہ اقبال چونکہ خود ایک سچے اور پکّے مسلمان ہیں اس لئے وہ دوسروں کو بھی اسلام کی حقیقی تعلیمات پر کاربند دیکھنا چاہتے ہیں مسلمان کی تخلیق کن کن عناصر کی ترکیب پر مشتمل ہے، انھیں کی زبانی سنئے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بعض صحابہ کرام نے سوال کیا کہ رسول کریم صلعم کے اخلاق بیان فرمائیے۔ انھوں نے فرمایا کہ کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰن۔ یعنی اخلاق حسنہ کی قرآن پاک میں تعلیم ہے، آپ ہوبہو اسی کے نمونے تھے. علامہ اقبال بھی مرد مسلمان ایسے شخص کو پکارتے ہیں ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

آیۃ لِتَکُوْنُوْا شُہَدَاءَ عَلَی النَّاسِ کی تفسیر یوں کرتے ہیں ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

قرآن پاک میں مسلمانوں کا امتیازی وصف خداوند کریم نے ان آیات شریفہ میں ظاہر فرمایا ہے۔

اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ اور اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ.

یعنی آپس میں شیر و شکر اور اعدار کے لئے سم قاتل۔ یہی علامہ اقبال بھی کہتے ہیں ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

مومن اور غیر مومن کا فرق اور ان کی پہچان کی نشانیاں آپ نے بہت سنی ہوں گی۔ ایک اور علامت سنئے۔ حقیقت سے کتنی لگتی ہوئی کہی ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق

علاّمہ اقبالؔ اسلام کی ان صفات کے پرستار ہیں۔ ان کے نزدیک کسی قوم میں ان صفاتِ حسنہ کا موجود ہونا ہی اس کی سربلندی اور برتری کی ضمانت ہے۔ لیکن جب وہ مدعیان اسلام کو ان پاکیزہ صفات سے خالی پاتے ہیں اور مسلم قوم کے زوال پر نظر کرتے ہیں تو وہ حیرت اور تعجب سے دیکھتے ہیں کہ مسلم قوم نے اپنی اخلاقی پونجی لٹا دی ہے اور اب بالکل نادار اور مُفلس بن کر اپنا وقار قومی بھی کھو چکی ہے۔ وہ بجائے مایوس ہونے کے طبیب حاذق کی طرح پہلے مرض تشخیص کرتے ہیں اور پھر اس مہلک قومی مرض کا نسخہ تجویز کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ وہ امراض کے ازالہ کی قوی توقع اور کامل اُمید رکھتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے سب سے پہلے نوجوانوں میں بصیرت پیدا کی، اُس کے بعد ان کو اسلامی رنگ میں رنگا اور چونکہ بصیرت کی بھٹی میں چڑھ کر آپ کو اس رنگ کے پختہ ہونے کا پورا یقین ہو چکا ہے اس لئے اب مسلم قوم کی حالت زار ان کو سُنا کر، غیرت ایمانی سے ان کو سرشار کر کے تیسرا سبق "جہد و عمل" کا پڑھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نونہالانِ قوم عقل و بصیرت اور جذبۂ ایمانی کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان عمل میں کود پڑیں، اور مسلسل جد و جہد اور پیہم سعی و عمل سے قوم کی قسمت کا نقشہ بدل دیں۔ وہ اس طریقہ کار کی کامیابی پر پورا یقین رکھتے ہیں اس لئے وہ برملا کہتے ہیں کہ ؎

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار　　فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

ویسے تو مسلمانوں کے شاندار ماضی اور ان کے مہتم بالشان کارناموں کی حسرت آمیز یاد اور ان کی موجودہ زبوں حالی، نکبت اور پستی کا ماتم انگیز احساس ہر دل میں ملے گا، خواہ علمائے کرام کی درسگاہیں ہوں یا صوفیائے عظام کرام کی خانقاہیں، سیاسین کی جلسہ گاہ ہو یا معاشین کی جائے اجتماع، بحث کا موضوع ہر جگہ یہی ہے، لیکن اس بحث و نظر کا نتیجہ کسی متحدہ صورت میں کبھی بھی رو نما نہیں ہوا۔ ایک جماعت اگر ایک نسخہ علاج تجویز کرتی ہے تو دوسری جماعت اسی کو سم قاتل بتاتی ہے۔ ایک گروہ ایک دوا کو تریاق بتا کر دیتا ہے تو دوسرا اُسی کو زہر ہلاہل کہہ کر ہلاکت کا پیش خیمہ بتاتا ہے۔

اگر کسی مریض کا مرض ہی اطبار کی سمجھ میں نہ آئے تو بیشک مختلف حکیموں کے نسخے تشخیص میں اختلاف ہونے کی وجہ سے جدا جدا ہو سکتے ہیں، لیکن جب مرض متعین اور متحقق ہے تو پھر ان مختلف جماعتوں اور گروہوں کا اختلاف آخر کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھوں نے اس موضوع کو صرف بحث و نظر ہی تک محدود رکھ کر عمل اور جد وجہد کے خارزار میں قدم بڑھانا اپنے لئے خطرناک سمجھ رکھا ہے، اور اپنی اس بے عملی اور سکوت کی آڑ بعض تو واعظانہ صبر و قناعت اور دوسرے صوفیانہ تسلیم و رضا اور کچھ سیاسی تدبر اور دور اندیشی میں لے لیتے ہیں۔

علامہ اقبال جن کی شاعری ایک معجزہ ہے، اور جو اس ازلی اور ابدی پیغام کی حامل ہے، جسے اگر پیغام ربانی اور اسوۂ رسول ؐ کی تشریح اور تفسیر سے تعبیر کیا جائے تو بجا ہو، ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ وہ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر فطری طور سے روتے تو ہیں لیکن دل کی

آنکھوں سے، اور پھر یونہی مجلس برخاست نہیں کرتے بلکہ اپنے پیغام کے ذریعہ ایسا طریقہ کار اور لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں جس کا ایک ایک لفظ قوم کے ہر ہر فرد میں ایک نئی زندگی، نیا ولولہ، نیا جوش اور نئی امنگ پیدا کر دیتا ہے۔

کاہلی، سستی، لفاظی اور سطحیات سے علامہ اقبال کو چڑھ ہے وہ تو جد و جہد اور تگ و دو کے قائل ہیں "یقینِ محکم" اور "عملِ پیہم" کو کارزارِ حیات میں کامیابی اور فتحمندی کی اصل سمجھتے ہیں ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم | جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں وہ ان کی نظر میں بے حقیقت اور ہیچ ہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علم لاہوتی | حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور | تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار | شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل | دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

غرض علامہ اقبال یہ نہیں چاہتے کہ مسلمان عاجز و لاچار بن کر بغیر کسی مقصد کے بیکار اور نامراد زندگی گذاریں۔ وہ جمود و سکون کو موت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلسل عمل، پیہم جد و جہد اور لامتناہی سعی و کوشش کو زندگی و حیات کہتے ہیں ؎

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم | ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موجے زخود رفتہ تیز خرامید و گفت | ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

علامہ اقبال رجائی ہیں، افسردگی اور مایوسی ان کے کلام سے کوسوں دور رہے، جو ہماری اردو شاعری کی جان بن چکی تھی اس کے برعکس

ان کے ہر ہر شعر سے آس اور اُمید بندھتی ہے۔ مایوسیوں کا دھندلکا اور نا اُمیدیوں کا اندھیرا غائب ہو جاتا ہے، اور اس کی شعاعوں کے ساتھ پھر صبح صادق نمودار ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تسلّی دیتے ہیں ؎

اے مسلم دل خستہ مصائب سے نہ گھبرا　　خورشید نکلتا ہے سرا پردۂ شب سے

جد و جہد اور سعی و کوشش ہی سے مقصود تک رسائی ممکن ہے۔ حالات کیسے ہی مخالف ہوں، راستہ ہزار خطرات سے گھرا ہوا ہو لیکن عزم و ثبات، خود اعتمادی اور جد و جہد کے آگے سب موانع اور خطرات غائب ہو جاتے ہیں اور کامیابی اور فتحمندی چشم براہ رہتی ہے ؎

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی　　مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا　　کر اپنی رات کو داغ جگر سے نورانی

آخر میں اُمتوں کی حیات اور موت کا فلسفہ بھی علامہ کی زبان سے سنئے اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر مسلم قوم کا احیا ہو سکتا ہے تو وہ اسی اور صرف اِسی نسخہ سے؟ ؎

دلِ مردہ، دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ　　کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پُرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے　　نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ

علامہ اقبال کے عطا کردہ اسباق کے نادر اور بے بہا خزینہ میں سے ان چند موتیوں کا انتخاب ہزار بے پایاں سمندر میں سے ایک قطرہ سہی لیکن حقیقتاً نوجوانوں کا بصیرت اور دانش و بینش سے مالا مال ہو کر اسلامی رنگ میں رنگ جانا اور پھر جد و جہد اور سعی و عمل کو اپنا مسلک بنا کر میدان عمل میں اُتر آنا مسلم قوم کی نصرت، کامیابی، فتحمندی، سربلندی اور نجات کی راہ ہے ؎

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشت ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مثنوی اسرارِ خودی

مولینا محمد اسلم صاحب جیراجپوری

یہ مضمون رسالہ "الناظر" بابت ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے اس پر نظر ثانی کر کے ہم کو اقبال نمبر کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ اس مضمون کو حضرت علامہ اقبال مرحوم نے بھی بہت پسند کیا تھا، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اس خط کے ذریعہ فرمایا جس کا عکس مقابل کے صفحہ پر موجود ہے۔

مثنوی اسرار خودی جب شائع ہوئی تو اس پر اعتراضات کئے گئے، جس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ مرحوم نے تصوف کے بعض معتقدات سے اختلاف کرتے ہوئے افلاطون اور خواجہ حافظ کو بزِ گوسفند لکھا تھا جو ان کے معتقدین کو ناگوار ہوا۔ اس کے جواب میں مثنوی رازِ خودی لکھی گئی جس کا مقصد زیادہ تر ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی پر نازیبا حملے کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا تھا۔ مولینا نے ان اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور تصوف کے مسئلہ پر اصولی بحث فرمائی ہے جو نہایت اہم ہے۔ ہم مولینا کی اس عنایت کے بہت شکر گزار ہیں۔"

(جوہر)

ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرار خودی جب سے شائع ہوئی ہے اس

لاہور ۱۷ مارچ ۱۹ء

مخدومی السلام علیکم

آپ کا تبصرہ اسرار خودی پر رسالہ ادیب میں دیکھا ہے جس کے لیے آپ کا نہایت شکر گزار ہوں -

"دیدست مردے دریں قحط الرجال"

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح و توضیح تھا خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہیں سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی - اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔ بہرحال میں نے وہ اشعار حذف کر دیے ہیں اور ان کی جگہ اس لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں - غرض کہ اشارات سے فہم اکثر لوگ اشعار کے ظاہر پر منحصر تھے

"گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است"

بلکہ ایسی قسم بنا سے ہم خود مطمئن نہ تھے اور یہ رنگ نہ بدلا جو ان اشعار کو جوڑ
کر دیتے رہتی ہے — دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث
تھا جیسا کہ ہم نے لکھا احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا جو وقتاً فوقتاً
شائع ہوتا رہتی ہیں — تمام جو پروفیسر نکلسن نے اس خیال عام اب نے ضمنوا بھی
کا دیباچہ دوسری ایڈیشن سے حذف کر دیا جاتا تھا اور دونوں کی ترجمہ انگریزی
مرکز ایا ہے کہ نہ انگریزی کا ایڈیشن ساتھ شائع کرے ہیں —

بیرونی ادب مطلع الذی کی فی مراقبہ متعلق نہیں سمجھا کیونکہ اگر اطلاع فی الکمال رادا ہے
(اور یہ کا نعیم قرون اول میں اس کا پایا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا
ہاں جب کیونکہ فلسفہ بنے وہ کوشش کرتا ہے اور مجمل اثرات کرنے لگا عام وہ خیالات
رکھتا ہے کہ اسلام نے وہ ذات جو متعلق مرد کا خیال کو کرکے شخص نظریہ پیش کرتا ہے تو اسی کا ربع
اس کے خلاف شکایت کرتا ہے — نیچے ایک تاریخ لکھ کر نے کی شروع کی تھی تم اور اس کا
مسئلہ نہ رہا اور ایک دو باب لکھ رہا تھا — پروفیسر نکلسن "اسلامی شاعری اور تصوف"
جو نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہوگا مگر یہ ہے کہ یہ کتاب ایک حد تک
رہی کا کر دے جو میں کرتا جاتا تھا — منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین جو فرانسیسی میں ہر کی
"ترجمت" ہے — فرانس کی میں شائع ہوگیا ہے مولف نے زبان عام بنا سعید محمد کی اب کی یک
ہیں نہ اب لکھ سکتا ہوں جس کے اصل معتقدات پر اس بہانے تری کا روشنی پڑتا ہے

اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان منصورہ کے بارے میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں
جو کچھ منصورہ کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ منصورہ میں موجودہ قرآن ثابت ہوتا ہے منصورہ بزرگ تھے
مسلمان نہیں تھا مگر اس کے اسعد، والد اور بیٹے ہو گئے۔ بہر حال یہ بڑی دلچسپ چیز تحقیق طلب ہے ہم امید کرتے ہیں امید ہے کہ آپ
کہ مجھے نقوش کی تصویریں مرسل فرمائیں گے اور ایک آدھ جلد دنیا کو معلوم ہو جائے گی۔

مجھے امید ہے کہ اس طرح کی خدمت کا آپ مجھے موقع فرمائیں گے۔ آپ کی توجہ سے مجھے بڑا تکلیف طلب کرنا پڑا مجھے
یہ مخصوص سلسلہ نکالنے کی ضرورت ہوئی۔ ایسا ہی رسالہ بھی ہو گا۔

از خاکسار محمد اقبال لاہور ۱۹ مارچ

وقت سے اس پر مخالفین کے اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس مثنوی میں تصوف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کو بز و گوسفند لکھا ہے. چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

راہبِ اول فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکم او بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

خواجہ حافظ کے متعلق لکھا ہے :-

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ او — از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملتِ میخوارگاں — آں امامِ ملتِ بیچارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است — فتنۂ ناز و ادا آموخت است
دلربائی ہائے او زہر است و بس — چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس
از بزِ یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ عودش حجابِ اکبر است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش
محفلِ او درخورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر — الحذر از گوسفنداں الحذر

مخالفین کو افلاطون کی نسبت کم لیکن خواجہ حافظ کی بابت زیادہ ملال

ہے، کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مقدس بزرگ بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حمیّت کے جوش میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔ میں ایک عرصہ سے اس بحث کو دیکھ رہا تھا، لیکن اس وجہ سے خاموش تھا کہ یہ اصولی بحث نہ تھی۔ چند روز ہوئے میرے پاس مثنوی "راز بیخودی" ایک دوست کے ذریعہ سے پہنچی جو خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنر ڈپٹی کلکٹر محکمۂ انہار پنجاب نے "اسرار خودی" کے جواب میں لکھ کر شائع کی ہے۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کچھ ضرور ان مثنویوں پر لکھوں، اس لئے مجبوراً مہر سکوت کو توڑنا پڑا۔ لیکن میرے اس لکھنے کا منشا صرف یہ ہے کہ اس بحث کو اصل مرکز پر لاؤں، تاکہ آئندہ موافقین یا مخالفین جو کچھ لکھیں وہ قوم کے لئے مفید ہو، ذاتیات سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔

احترامِ سلف ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا[1] کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو خود اُن کی ذات پر حملے ہونے لگے اس لئے کہ قدیمی اصول ہے:

بزرگش نخوانند اہلِ خرد — کہ نامِ بزرگاں بزشتی برد

دوسرے نفسِ مسئلہ جو مفید تھا، ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آگیا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب جنھوں نے اس دھوم دھام سے اس مثنوی کا جواب

---

[1] میں خوش ہوں کہ اس مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ خواجہ حافظ کے متعلق لکھا تھا اس کو حذف کر دیا اور اس کے بجائے نئے اشعار لکھدیئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کا مفید اور دلچسپ دیباچہ بھی نکال ڈالا گیا جس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۲

لکھا ہے وہ بھی اصلی بحث کو نظر انداز کر گئے اور صرف افلاطون اور حافظ کی مدح سرائی اور ڈاکٹر صاحب پر مثلیں چست کرنے میں مشغول رہے۔ بزدگو سفند کے جواب میں کہیں شغال اور کہیں خر بنایا ہے، اور دشمن اسلام اور رہزن اسلام وغیرہ خطابات بخشتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

خود زما خیلے بسے وحشت سگاں　　جامہ زن در نیل دستاں چوں شغال
فلسفی فطرت زدیں برگشتگاں　　در بیابانِ جنوں سر گشتگاں
عقل و دین و داد را دشمن ہمہ　　در لباسِ سخنگاں رہزنِ ہمہ
ازدم گفتار دستاں داستاں　　فلسفہ در دل تصوف بر زباں
دشمن جاں آمدند اسلام را　　رہزنِ جاں آمدند اسلام را
وائے برایں پختگان عقل خام　　اولیا را ایش وبز کردند نام
ازدم مکر شغالاں الحذر　　الحذر از بد سگالاں الحذر

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

ازخودی پیغارہ زن اسلاف را　　کردہ پامال جنوں انصاف را
بندۂ دنیا بہ دنیا دیں فروش　　سربسر ملت فروش آئیں فروش

پیرزادہ صاحب کے ان اقوال کو جب صوفیانہ علم اور حسنِ ظن کی میزان میں ہم تولتے ہیں تو ان کی سبکی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی رائیں پہلے سے بھی لوگوں کی چلی آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ اس کے اول مجرم نہیں ہیں، چنانچہ مشہور ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے عام منادی کرا دی تھی کہ دیوان حافظ کوئی نہ پڑھے کیونکہ لوگ اس کے ظاہری معنی سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔ نیز مولانا حالی مرحوم نے حیات سعدی میں لکھا ہے:۔

"خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی اور صورت پرستی و کامجوئی کو بھی، وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ، غرضکہ کسی شے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر، مآل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے، اور آزادگی، رسوائی بدنامی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبر سے کام نہ لینا، توکل و قناعت کے نشہ میں اپنی ہستی مٹا دینا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و ما فیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجاب اکبر جاننا حقایق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً کھو دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بیفکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے ان کو لے اڑتی ہے، اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے۔ اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو

یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابرِ صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں
جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گذری ہے اور
جن کا شعر شریعت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت
کی آواز ہے، تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشیں ہو جاتے ہیں۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک ابرار و
احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل واستغنا و قناعت
کا پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش والواط کو بے فکری، ناعاقبت
اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے، اور قوم
کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور
خانماں سوز ہے جیسی دوسری"۔

ہم نے خود اپنی تصنیف "حیات حافظ" میں ان رایوں کو نقل کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، لیکن ہمارے جواب کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "حسن کا معیار یہی ہے کہ وہ کمال درجہ کا دلکش ہو۔ عشاق کی رسوائی سے حسن بُرا نہیں قرار پا سکتا۔" باقی حافظ کی غزل کے ان اثرات سے جو مولانا حالی نے لکھے ہیں، کون انکار کر سکتا ہے! بے شک یہاں تک ہم پیرزادہ صاحب کے ہمنوا ہیں کہ ؎

الادب پیمانہ بر مستاں مزن | شیشۂ خود بر سرِ سنداں مزن
در گذر از بادہ خوارا ے محتسب | مست را معذور دارا ے محتسب

لسان الغیب | مولانا حکیم فیروز الدین احمد صاحب طغرائی نے ڈاکٹر صاحب کے جواب میں جو رسالہ "لسان الغیب" کے نام سے شائع کیا ہے اس میں جو

پہلو جواب کا اختیار کیا ہے وہ "سوال از آسمان و جواب از ریسماں" کا مصداق ہے۔ شعرا اور تذکرہ نگاروں نے کلام حافظ کی جو مدح کی ہے وہ شاعری اور صوفیانہ رموز کے لحاظ سے ہے، اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کلام کی خوبیوں کو ڈاکٹر صاحب بہ نسبت حکیم صاحب موصوف کے زیادہ سمجھتے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ان اثرات کے متعلق ہے جو خواجہ کے کلام سے جذبات پر پڑتے ہیں، اس لئے ان محامد و مدائح کا نقل کر دینا جو ڈاکٹر صاحب کے بھی پیش نظر ہیں، جواب کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں حکیم صاحب موصوف نے شعر العجم سے بہت کچھ استدلال فرمایا ہے کہ علامہ شبلی نے کلام حافظ کو چناں و چنیں لکھا ہے، مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ اسی شعر العجم میں عمر خیام کے تذکرہ میں ہے کہ

"افسوس ہے کہ خیام خواجہ حافظ کی طرح صوفی نہ تھا، ورنہ اس کی شراب بھی شراب معرفت بن جاتی۔" اسرار خودی میں خواجہ حافظ کے جن اشعار کی طرف تلمیح ہے، اُن کے جو لطیف معانی حکیم صاحب نے بیان کئے اور جو جو صوفیانہ نکات اُن سے نکالے ہیں، وہ ہر شاعر کے ہر شعر سے نکالے جا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کچھ عرصہ ہوا میں نے کسی مضمون نگار کا مضمون پڑھا تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خواجہ آتش لکھنوی کا کلام تصوف اور معرفت سے لبریز ہے، اور اس کے شواہد بھی لکھے تھے۔ نیز بمبئی کے کسی اخبار میں ایک گبر کا یہ دعویٰ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ خواجہ حافظ آتش پرست تھے۔ مدعی نے خود حافظ کی غزلوں سے اس پر استدلال کیا تھا منجملہ اُن کے ایک غزل جو مجھے یاد رہ گئی یہ ہے ؎

بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود
کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود

اس غزل کے مندرجۂ ذیل شعر کو اس نے اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔

باغ تازہ کُن آئینِ دینِ زردشتی ۔۔۔ کنونکہ لالہ برافروخت آتشِ نمرود

حافظ و عرفی ۔ ہم کو سب سے زیادہ جو بات مثنوی اسرارِ خودی میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے:

حافظ جادو بیاں شیرازی است ۔۔۔ عرفی آتش زباں شیرازی است

ایں سوئے ملکِ خودی مرکب جہاند ۔۔۔ واں کنارِ آبِ رکنا باد ماند

ایں قتیلِ ہمتِ مردانۂ ۔۔۔ آں ز رمزِ زندگی بیگانۂ

بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز ۔۔۔ زندۂ ! از صحبتِ حافظ گریز

اس لئے کہ اگر شاعری ہی کے دائرہ میں رہنا ہے تو حافظ کو چھوڑ کر عرفی کو مقتدا بنا لینا بعینہ اس مثل کا مصداق ہے "فرمن المطر و وقع تحت المیزاب"

حقیقت یہ ہے کہ ہماری شاعری خرِ دجال ہے خرِ عیسیٰ نہیں ہے۔ اس کے چند مخصوص عنوانات ہیں جن کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہے، اُنہیں کو شعرا الفاظ کے نئے نئے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ زندگی کے لئے کسی عملی شاہراہ کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ سوائے ادبی لطافت کے کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن شریف نے جس شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اس کا بہترین یا بدترین نمونہ یہی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ مولانا حالی نے بہت صحیح فرمایا ہے ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر ۔۔۔ عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر ۔۔۔ زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

ہوا علم دیں جس سے برباد سارا ۔۔۔ وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

عقیدتمندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر پھر تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے۔ عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے۔ رہیں ادبی خوبیاں تو ان کے لحاظ سے خود عرفی اسی شمع کا پروانہ ہے۔ کہتا ہے ؎

بگردِ مرقدِ حافظ کہ کعبۂ سخن است ۔۔۔ درآمدیم بعزمِ طواف در پرواز

بیشک نخوت اور خود ستائی کہیں کہیں اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، لیکن وہ خود ڈاکٹر صاحب کی مصطلحہ خودی کے متضاد ہے۔

بحث خودی | پیرزادہ صاحب نے خودی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خواجہ حافظ کے جوشِ حمایت میں ڈاکٹر صاحب کے مفہوم مقصود کو سہواً یا قصداً نظرانداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف لکھدیا ہے کہ "خودی کو بمعنی غرور میں نے استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا مقصود محض احساس نفس یا تعیین ذات ہے"۔ باوجود اس تصریح کے اس لفظ کے جو معنی انھوں نے خود ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے نکالے کی کوشش کی ہے، اس میں صریحی طور پر انصاف سے تجاوز کر گئے ہیں، اس لئے کہ جب کوئی لفظ کسی اصطلاحی معنی میں رکھ لیا گیا تو اس کے لغوی معنی لے کر اعتراض کا پہلو نکالنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس شعر پر ؎

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت　　تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

جو اعتراض پیرزادہ صاحب نے کیا ہے کہ اُس کا انبیاء کی عظمت و شان پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ ہم بھی اس سے متفق ہیں، لیکن ہمارا جہاں تک خیال ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون اس کلام سے اخذ کیا ہوگا جو کسی بزرگ صوفی کا ہے ؎

صد ہزاراں سبزہ پوش از غم بسوخت　　تا کہ آدم را چراغے بر فروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح　　تا دریں حضرت دگر در گشت نوح
صد ہزاراں پشہ در لشکر فتاد　　تا براہیم از میاں سر بر نہاد
صد ہزاراں خلق سر ببریدہ گشت　　تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنار شد　　تا کہ عیسیٰ محرم اسرار شد

صد ہزاران خلق در تاراج رفت　　تا محمدؐ یک شبے معراج رفت

خودی کا عرفی مفہوم مراد لے کر پیرزادہ صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں، ان تیروں کا نشانہ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث بالکل لفظی ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ طبیعت نے جب مسلمانوں کے تنزل کے اسباب وعلل دریافت کرنے کی طرف توجہ کی تو یہ سراغ پایا کہ امت اسلامیہ سے قوتِ عمل فنا ہو گئی، اور جو عملی ولولہ اور جوش سلف میں تھا، وہ خلف میں نہیں رہا، اور چونکہ ترقی کا مدار عمل پر ہے اس لئے پھر اسی قوت عمل کو زندہ کر کے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اس قوت عمل کے احیاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کو اپنی ہستی کا بھی احساس ہو۔ اسی نظریہ کی تعلیم کے لئے انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ خودی کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست　　ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی ست

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد　　آشکارا عالم پندار کرد

صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او　　غیر او پیداست از اثبات او

می شود از بہرِ اغراضِ عمل　　عامل و معمول و اسباب و علل

زندگی محکم ز ایقاظِ خودی ست　　کاہد از خواب خودی نیروے زیست

اس مفہوم کو مثنوی رموزِ بیخودی میں اور بھی صاف کر دیا ہے ؎

تو خودی از بیخودی نشناختی　　خویش را اندر گماں انداختی

جوہرِ نوری ست اندر خاکِ تو　　یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو

واحد است و برنمی تابد دوئی　　من ز تاب او منستم تو توئی

خویش دار و خویش باز و خویش ساز
نازہا می پرور داندر نیاز
خو گر بیکار رہیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں ؎

ہرچہ گفتی از خودی حاشا غلط
سربسر از لفظ تا معنیٰ غلط
در حیاتِ کس خودی را دخل نیست
خلق عالم نورس این نخل نیست
در حریمِ حق خودی را نیست بار
در حرم مزدورِ دیواں را چہ کار
از خودی بگذر کہ کار این ست و بس
خاصہ مسلم را شعار این است و بس

دراصل پیرزادہ صاحب خودی کے لفظ ہی سے بیزار ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اے خودی را مرکب خود ساختی
دبۂ دریائے ہیل انداختی
اے خیالِ خامت اسرارِ خودی
پختہ کارِ راز پندار خودی
زہر را تریاق می گوئی بگوئے
بر ہلاکِ خویش می پوئی بپوے
در عیارستانِ بازارِ صفا
سکۂ قالِ تو باشد نارروا

ہم کو حیرت ہے کہ "عیارستان بازار صفا" میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کے "انا الحق" کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی "انا، انا" سے اس قدر بیزار !!

منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں ؎

زاہداں منصور را خوں کردہ اند
بکیس و معذور را خوں کردہ اند
مردِ حق گو را بدار آویختند
بے گنہ را خوں بناحق ریختند
ہلہ اے زہاد آشفتہ دروں
ہلہ اے ستیزہ کاران جنوں
خونِ منصور از شما خواہم گرفت
خفتہ خوں را خونبہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت "مسئلہ اعیان کی وجہ

سے کی ہے اس کے جواب میں پیر زادہ صاحب نے شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب "تلویح" سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اس کی مدح سرائی فرمائی ہے. فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لئے یہ جواب ایک لطیفہ ہے. اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے. پوچھا کہ اس کے درجے کا کوئی اور حکیم نہیں؟ ارسطو نے کہا نہیں. پھر مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کے نام لئے - ارسطو نے سوائے بایزید کے اور کسی کو افلاطون کا ہم مرتبہ نہ بتایا. چنانچہ پیر زادہ صاحب اسی بنیاد پر اُس کی بابت کہتے ہیں. ع

جبرئیلے در لباسِ آدم است

ہم کو امید تھی کہ پیر زادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کریں گے لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا. کہتے ہیں ؎

اے کہ حافظ را شماتت میکنی　　رند میکش را ملامت میکنی
اے بعلم خویش مخمورِ عمل　　تو چہ دانی سرِ مستانِ ازل

بحثِ تصوف اصل مرکزِ بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام ایک حقیقی پیغامِ عمل ہے. باوجود پیرو اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آکر غالب ہوگیا ہے اور وہ تصوف ہے. اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس[1] کشی نے مسلمانوں کی قوت عمل کو باطل کر دیا ہے.

چونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیاتِ اسلامیہ میں ساری ہوگیا ہے اور ہر قوم کے ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے، اس لئے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوت عمل جاتی

---

[1] تصوف نفس کشی سکھلاتا ہے لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، وہ صرف اصلاح نفس کا خواہاں ہے.

رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوع انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفۂ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا اس وجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیساکہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے دیباچے میں خود اُنھیں کے الفاظ میں نقل کیا ہے، یہ ہے:۔

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔
(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔
(۳) تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اُٹھایا ہے۔
(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کردینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے بلکہ انھوں نے خود تحقیقات کی ہے۔

(۱) میرے آباؤ اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میرا میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔

(۲) فلسفۂ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہوگئی تھی، کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی منجر بہ تصوف ہے۔

(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا، اس واسطے میں نے تصوف کو ترک کردیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا نسبی و نسبتی تعلق ایک قدیم صوفیانہ خاندان سے ہے۔ میرے آباؤ اجداد

نے نسلاً بعد نسلٍ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جدِ اعلیٰ ہیں، اس وقت تک تصوف کے دامانِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ "اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے۔"

مسئلہ عینیت | تصوف کا مسئلہ "عینیت" افلاطون کے مسئلہ "اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ "ہمہ اوست" کے عقیدہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ہر ذرہ عین آفتاب ہو گیا اور خالق اور مخلوق متحد ہو گئے۔ چند اقوال بطور امثال کے لکھتا ہوں۔

"انا الحق"

"سبحانی ما اعظم شانی"

"سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا"

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ‏ ‏ خود بر سرِ بازارِ خریدار برآمد

خود انا الحق زد از لب منصور ‏ ‏ خود برآمد ز شوق بر سرِ دار

گفت[۱] انا احمدِ بلامیمے ‏ ‏ از زبانِ محمدؐ مختار

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست ‏ ‏ خیالِ آب و گل در رہ بہانہ

یہاں تک کہ بعض یکہ تازانِ میدان تفرید کلمہ توحید کو بھی شرک خیال

---

[۱] خود ڈاکٹر اقبال کو بھی یہ میم پسند نہیں آیا، ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے ‏ ‏ قوم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے

معلوم نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ کے بعد جس طرح تصوف کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال بدلا ہے اسی طرح اس عقیدہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی یا ابھی تک "مخمورِ صہبائے محبت" ہیں اور "خاکِ عرب کے سونے والے کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔"

کرتے ہیں

اے پسر لا الہ الا اللّٰہ　　خود زشرک خفی است آئینہ دار
ہست شرک جلی رسول اللّٰہ　　خویشتن را ازیں دو شرک برآر

ایک اور سرمست کا ترانہ سُنئے۔

من ہم زمینم ہم سما من باتو ہستم جملہ جا　　من مصطفٰے را ہم خدا، من ملحدِ دیرینہ ام

فرعون اور موسٰی علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے۔

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد　　موسئی با موسیٔ در جنگ شد

تجرید کا یہ نعرۂ مستانہ بھی سُن لیجئے، جس میں قافیہ کی پابندی بھی ترک کردی گئی ہے۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک　　ترک دنیا ترک عقبیٰ ترک مولیٰ ترک ترک

ان "سطحیات" کا ایک انبار ہے، ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ ناآشنائے سِرّ وحدت کا قلم لرزتا ہے، اور یہ ان حضرات کے اقوال ہیں، جن کا ایک ایک لفظ "عیار ستاں بازار صفا" میں بے بہا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

علم وعقیدت کی جنگ | تمام مصلحوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ علم وعقیدت کی جنگ ہے مصلح دیدۂ تحقیق سے دیکھ کر ڈراتا ہے کہ اے قوم جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے کیونکہ زہریلا سانپ ہے مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں یہ تازیانہ ہے۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت　　کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

اس جنگ کے ہزارہا تماشے دنیا دیکھ چکی ہے لیکن ابھی تک بدستور

اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، قوم اس کو جاہل، دشمن اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالی، ابن رشد، اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے، کسی کو قید خانے میں جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علم یقینی پر ہو، محض رسمی عقیدہ "عیارستان بازارِ تحقیق" میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

تصوف اور اسلام | سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن و حدیث تصوف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقین یورپ و دیگر محققین جن میں سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے، کوئی اس کا ماخذ کلیساؤں کی رہبانیت کو قرار دیتا ہے، اُن کی تحقیقات لکھنے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے یا اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ابتدا ابتدا میں جو اہل زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے، اُن کو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے، یعنی جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے فرمایا ہے۔

پیشِ طاق صوفیاں احساں بود   اتّباعِ سُنّت و قرآں بود

اس زمانہ میں تصوف اخلاص کا نام تھا جس کو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح غزالی وغیرہ ائمہ اسلام نے لکھی ہے۔

لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے، چنگیز اور

ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کردی تو ان کی ہولناک خونریزیوں سے امت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے، طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں سُست ہو گئیں، زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، میلانِ خاطر زہد اور ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا، اور سرمایۂ توکل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی، بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا، کلاہِ نمدی کو تاجِ زر پر ترجیح دی گئی اور پکار اُٹھے ؎

گوشۂ عافیت و گنجِ قناعت گنجیست　　　　که بشمشیر میسر نه شود سلطاں را

بفراغِ دل زمانے نظرے بہ ماہروئے　　　　بہ ازانکہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہائے وہوئے

مَے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ　　　　ہمیں بس ست مرا صحبتِ صغیر و کبیر

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں دروُ درجست　　　　کلاہِ دلکش است اما بترکِ سر نمی ارزد

ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ ''شیوۂ قلندری'' کے مقابلہ میں ''رہ و رسمِ پارسائی دور و دراز'' نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں ''خلوت در انجمن'' ہونے لگی اور سجادہ ہی پر ''سفر در وطن'' کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں۔ شریعت اور حقیقت دو جدا گانہ راستے قرار پائے، اور ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی۔ علماء و فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے۔ یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے

تو نقصان نہ ہوتا، لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا، اور ادبیات اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر طاری ہو گیا۔

زوال شوکتِ اسلام شوکتِ اسلام کے زوال کے اسباب یوں تو پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہو گئے تھے، مثلاً سیاست کی خرابی، یعنی وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا، جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا، ہاتھوں سے جاتی رہی، اور اس کے بجائے استبدادی حکومت قائم ہو گئی، جس نے تمام امت کو غلام بنا دیا۔ مسلمان بیگناہ قتل کر دیئے جاتے تھے۔ ائمہ و علماء جو اپنے زمانے کے روشن چراغ تھے، بیشتر زیر عتاب، زیر خنجر یا زیر طوق و زنجیر رکھے جاتے تھے، اور حق گو زبانیں اس قدر خاموش کر دی گئی تھیں کہ ان مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس طرح پر "مسلم" حریت عمل سے محروم کر دیا گیا۔ پھر علمی تقلید، جس سے حریت فکر بھی جاتی رہی۔ یہ شکنجہ ایسا سخت تھا کہ ایک زمانہ میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ اہل علم اس خوف سے کہ کہیں کوئی دشمن ان کے اوپر تہمت لگا کر قتل نہ کرا دے، اپنی صحت عقیدہ کی سند قاضی سے لے کر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلام میں اس بیرونی عنصر کے شمول سے جو جمود پیدا ہوا اس نے بھی بہت کچھ ان اسباب زوال کو تقویت دی، اور خاصکر ہندوستان میں تو اسلام کی حالت اور بھی خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم شخص یعنی قومیت کا مشہور مبصر ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب "تمدن ہند" میں یہاں کے مسلمانوں کی نسبت

یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ :۔

"وہ اسلام جو اس وقت ہند میں رائج ہے اس کی حالت بھی بالکل
ویسی ہی ہوگئی ہے جیسے ہند کے اور مذاہب کی۔ اس میں مساوات
بھی قائم نہیں جس کی وجہ سے اوائل میں اس کو اس قدر کامیابی
ہوئی تھی"

پھر ایک جگہ لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہو جائے
گا کہ اس مذہب کی یہاں آکر کیسی مٹی خراب ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے رموز بیخودی میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں کچھ بھی شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے ؎

مسلم از سِرّ نبی بیگانہ شُد
باز ایں بیت الحرم بُت خانہ شُد

از منات ولات و عزیٰ و ہبل
ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخ ما از برہمن کافر تر است
زانکہ او را سومنات اندر سر است

رخت ہستی از عرب برچیدۂ
در خمستان عجم خوابیدۂ

شل ز برفاب عجم اعضائے او
سرد تر ہست اشک او صہبائے او

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ
سینہ اش فارغ ز قلب زندۂ

قرآن شریف میں نص قطعی موجود ہے "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا" پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے محروم ہو گئے؟ میرے خیال میں اس کا جواب صرف یہی ہے جو قرآن شریف دیتا ہے "ان قومی اتخذوا ہذا القرآن مہجوراً" ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن
صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست　　از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش　　در نمی سازد بقرآں محفلش

اقبال اور انسانیت

حسن سبحانی صاحب متعلم بی۔ اے

اقبالؔ کی بے وقت موت سے صرف شعر و سخن ہی کی مجلس بے رنگ و رونق نہیں ہو گئی ہے بلکہ فلسفہ و ادب کو بھی وہ صدمۂ عظیم پہنچا ہے جس کی ایک مدت تک تلافی نہ ہو سکے گی۔ وہ ایک جادو نگار اور سحر طراز شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند فکر فلسفی اور روشن خیال مفکر بھی۔ ان کی ذات مغربی اور مشرقی علوم و فنون اور روایات کا بہترین امتزاج تھی۔ وہ اپنے ساتھ ایک عظیم پیام لائے تھے، اور اسی کو عمر کے آخیر لمحہ تک دنیا کے گوش گذار کرتے رہے۔

اقبالؔ شاعر تھے لیکن اگر ان کو صرف "شاعر" کہا جائے تو یہ ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہو گی۔ وہ شاعران معنوں میں ضرور تھے کہ انھوں نے اپنا پیام شاعری کے ذریعہ دنیا تک پہنچایا لیکن اگر ان کے کلام کی ہمہ گیری پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ شاعری کے اس بلند و بالا مرتبہ پر پہنچ گئے تھے جہاں شاعری "جزویست از پیغمبری" بن جاتی ہے، اور جہاں شاعر اپنی ذات کو خلاقِ عالم کی ذات میں اس درجہ فنا کر دیتا ہے کہ وہ اس سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔ ان کی شاعری "گل و بلبل" "ہجر و فراق" "نالہ و فریاد" اور شکوہ و شکایت تک محدود نہیں تھی، اگر ایسا ہوتا

تو ان میں اور ہندوستان کے قدیم و جدید شاعروں کے مرتبہ میں کچھ زیادہ فرق نہ ہوتا۔ ان کا کلام کسی ایک شخص کے حسن و جمال کے دلکش اور دل آویز بیان تک محدود نہیں رہا، بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع انسان کو بنایا، اور انسانیت کے مسائل کو حل کرنا اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا۔ انسانوں میں بھی وہ کسی خاص ملک یا فرقہ کے شاعر نہیں تھے، بلکہ ان کی وسعت نظر اور تخیل بلند نے انھیں ساری انسانیت کا شاعر بنا دیا تھا۔ ان کے نغمۂ شاعری کی آواز صرف کوہ ہمالہ سے ٹکرا کر نہیں رہ گئی بلکہ سمندروں، پہاڑوں اور دریاؤں کو طے کرتی ہوئی دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پہنچ گئی۔

اقبال ماضی و حال کے بھی شاعر ہیں اور مستقبل کے بھی۔ مستقبل کے شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کا کلام زمانے کی قید سے تقریباً آزاد ہے۔ انھوں نے دکھیاری انسانیت کو جو پیغام دیا ہے وہ آج اور آج کے بعد کل بھی کسی مردہ اور جامد قوم کے قوائے حیات کو زندگی عطا کر سکتا ہے۔ ہر سچے اور عظیم المرتبت شاعر کی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری کا مقصد انسانی زندگی کے حسن و قبح کو سمجھنا بتایا، اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا جو سرمایہ حیات چھوڑا ہے، اس میں انسانیت کے لیئے وہ زندگی بخش اور حیات پرور پیغام ہے جو سارے اختلافات اور تنازعات کو مٹا کر اتحاد و اتفاق کی ایسی خوشگوار فضا پیدا کر سکتا ہے جس میں انسانیت پھل پھول سکے۔

اقبال ایک عالمگیر شاعر تھے، اس لئے اگر ہم ان کے اس پیغام کو سمجھنا چاہتے ہیں جو انھوں نے ساری انسانیت کو دیا ہے تو ہمارے

لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس کے فلسفہ کو سمجھ لیں جس پر ان کی شاعری کی ساری عمارت کھڑی ہے، اور جس میں وہ انسانیت کی فلاح مضمر سمجھتے تھے یہ فلسفہ اقبال کے یہاں خودی کے نام سے مشہور ہے۔

فلسفۂ خودی کو پوری طرح سمجھنا بہت مشکل ہے اور اس مختصر سے مضمون میں اسے شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا مشکل تر، لیکن میں فلسفۂ خودی کے چند پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔

خودی سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خودی کے ذریعہ خدا تک پہنچنا ممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان اس بحر عظیم کا ایک قطرہ ہے جسے ہم خدا کے نام سے منسوب کرتے ہیں، لیکن اگر قطرہ اپنی ذات کے تمام اسرار و رموز کو نہ پا جائے اور خود اپنی ہستی کو قابلِ قدر نہ جانے تو وہ بحر عظیم کی حقیقت کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ انسان خدا کی ذات کا پرتو ہے، یا یہ کہئے کہ خدا انسان کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ پس اگر انسان اپنی حقیقت کو جان لے تو وہ اس خدا کو کما حقہٗ پہچان سکتا ہے جس کے جمال کا جلوہ خود انسان کی ہستی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے انسان کو لاچار اور بے بس قرار دیا ہے، اور اس کی شخصیت کو اتنا حقیر و ذلیل کر دیا ہے کہ گویا وہ کسی طرح لائق توجہ نہیں ہے۔ اقبال اس نظریہ کا سخت مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے انسان ایک خاص حد تک لاچار ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ عملی قوت سے یکسر محروم ہے یا وہ اپنے فہم و ادراک سے عروج و کمال کے تمام منازل طے نہیں کر سکتا ہے۔ وہ اس نظریہ کا بھی موافق نہیں ہے کہ انسان بہت حقیر ہے اور وہ کسی صورت

سے لائق عزت نہیں ہے - وہ انفرادیت کا علمبردار ہے اور انسان کو یہ پیغام دیتا ہے کہ وہ اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو پہچانے، اپنے وجود کو پورے یقین کے ساتھ مانے اور دوسری قوتوں سے تسلیم کرائے۔ اپنی شخصیت ہر موقعہ اور ہر جگہ پر بلند کرے اور دنیا کی کسی قوت کے سامنے سر نیاز خم نہ کرے۔ اگر اس کی ترقی و کامرانی میں فطرت مخل ہو تو اُسے بھی سخر کرے اور اپنی خودی کا سکہ اس پر بھی بٹھا دے۔ اقبالؔ کے نزدیک خودی کی موت انسان کی موت ہے، اس لئے اگر انسان اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے تو گویا وہ ساری کائنات سے منہ موڑ لیتا ہے۔ خودی کا کمال انسانی کمال ہے اور خودی کا زوال انسانی زوال۔ خودی کو پہچانے بغیر انسان زندگی کے ارفع و اعلیٰ مقاصد تک نہیں پہنچ سکتا۔ خودی کو اس یقین اور وثوق کے ساتھ تسلیم کرنا چاہئے کہ کوئی طاقت اُسے صدمہ نہیں پہنچا سکتی اور جو طاقت اس سے ٹکرائے گی، وہ پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔ خودی کا انکاری اقبالؔ کے نزدیک سب سے بڑا کافر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است　　منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

اقبالؔ کا خیال ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی ذات کو اجاگر کرنا چاہتی ہے اور اس میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ پیدا کرنے کی خواہش رکھتی ہے ؎

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی　　ہر ذرہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت　　تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

دنیا کی ہر شے کی طرح انسان میں بھی یہ قدرتی جذبہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو ہر جگہ ممتاز کرے، لیکن انسان اپنی ہستی کو اس وقت تک ممیز نہیں کر سکتا

جب تک کہ خودی کو نہ پہچان لے۔ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے، بلکہ اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت اور یکتائی پیدا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تخلقوا باخلاق اللہ" یعنی اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر اور جس حد تک اس فرد یکتا (خدا) کے مشابہ ہوگا اُس حد تک خود بھی یکتا ہو جائے گا۔

اسلام کے قبل عیسائیت اور بدھ مت میں انسانی زندگی — یکسر گناہ تصور کی جاتی تھی، اور خواہشات نفسانی و احساس خودی اس کے اسباب بیان کئے جاتے تھے۔ ان مذاہب کے نزدیک انسان اپنے اعمال کی نیکی اور اخلاق کی درستگی سے گناہ کا کفارہ نہیں ادا کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں نے مجبوراً اپنی نجات کی راہ حضرت عیسیٰ ؑ کے مصلوب ہو جانے میں ڈھونڈھ لی۔ مسیحی اور بدھ تعلیم نے انسانیت کو کوئی عزت نہیں بخشی لیکن جب اسلام آیا تو اپنے ساتھ انسانیت کی عزت و حرمت کا ایک نیا تخیل لایا اور انسانی عظمت کو تسلیم کیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے اور اس کی سرشت میں حق و انصاف کی راہ پر چلنے کا میلان رکھا گیا ہے، لیکن اگر وہ برے اور قبیح اعمال سے اپنے ازلی کمال کو زایل کر لیتا ہے تو یہ خود اس کا قصور ہے۔ شر انسانی وجود کے ساتھ لازمی نہیں، بلکہ انسان اپنے اعمال میں مختار ہے، وہ اپنی سیرت کی تشکیل جس نہج پر چاہے کر سکتا ہے۔ انسان نے امانت کا وہ بوجھ جسے زمین و آسمان نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا احساس ذات و شخصیت

کی ذمہ داری سمجھ کر اٹھالیا اور یہی جرأت اور بیباکی اس کی حقیقی عظمت کا سبب بنی اور اسی کی بدولت وہ نظام عالم کے تسخیر کرنے میں دن رات لگا ہوا ہے۔

اقبال نے اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر یہ کہا کہ انسان کا اخلاقی نصب العین اثبات خودی میں مضمر ہے، اور وہ خودی کو اس بلند درجہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جہاں خود خدا انسان کی خودی کو لایق اعتنا سمجھے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

چنانچہ جس نے اپنی خودی کو پہچان لیا اس پر عالم رنگ و بو کے سارے اسرار و رموز منکشف ہو گئے اور اس نے حقیقت کبریٰ کو پالیا ؎

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ

وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

انسان کی ذات اور انسان کے مقصد کی تکمیل اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ خودی کے تمام بھید کو پالے اور خودی کے یقین کو اپنی زندگی کی شمع ہدایت بنائے۔ اگر ہزار نمازوں، لاکھوں روزوں، ضبط نفس اور زہد و عبادت کے بعد بھی انسان کی خودی کی تشکیل نہ ہو تو اقبال کے نزدیک یہ نماز اور روزے بیکار ہیں ؎

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال ساری کائنات میں اگر کسی شے کو قابل عزت اور لائق توقیر سمجھتے ہیں تو وہ خودی ہے۔ اگر کسی نے اپنی خودی کو پہچان لیا تو سارے ارض و سما اس کے مطیع ہیں اور سارا عالم اس کا فرمانبردار، لیکن جو اس متاع بے بہا سے بے خبر رہا، اس نے نہ صرف اپنی زندگی بے مقصد گذاری

بلکہ اپنے خالق کی خوشنودی اور رضا بھی حاصل نہ کی ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق — فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

خودی ہی کے ذریعہ انسان زمین و آسمان پر چھا سکتا ہے، خودی ہی تک پہنچ کر انسان اپنے وجود کے مقصد کو پا سکتا ہے، اور اپنے وجود سے کائنات کے ہر ذرہ کو روشن اور منور کر سکتا ہے ؎

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود — حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و حیات

اقبال کے فلسفہ خودی کو مختصر طور سے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انسان کی بقا کا راز خودی میں مضمر ہے جب قوم کے افراد اپنی خودی کو نہیں پہچانتے اور اس کی قدر نہیں کرتے تو وہ قوم انحطاط اور ادبار کے تاریک غاروں میں گر جاتی ہے اور اس کی عملی و دماغی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ خودی کے یقین سے اگر اجتماعی نظام، سماجی مسائل ادب و دین بیگانہ ہوں تو جماعت تنزل پذیر ہو جاتی ہے ؎

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اقبال کا خیال ہے کہ خودی قوائے فطرت کی تسخیر سے کمال حاصل کرتی ہے۔ جس شے سے خودی کو استحکام حاصل ہو وہ خیر ہے اور جس سے ضعف و اضمحلال، وہ شر۔ خودی کو استوار اور محکم بنانے میں عشق کا سب سے بڑا درجہ ہے۔ اقبال نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عشق سے ان کی مراد وہ جذبۂ اندروں ہے جو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا ہو، وہ یقین محکم ہے جو کسی بلند اور پاک شے کے حصول میں ممد و معاون ہو۔ عشق سے مراد وہ حرارت اور رہمت ہے جو تکمیل ذات کے لئے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہو، مشکلات پر قابو پائے۔

عشق سے ایمان پیدا ہوتا ہے جو ساری رکاوٹوں کو اپنی رو میں خس وخاشاک کی طرح بہائے جاتا ہے۔ عشق و عقل کا موازنہ اقبال نے کثرت سے کیا ہے۔ وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ عقل شکوک وشبہات کا نام ہے، اس میں والہانہ جذبہ نہیں ہوتا اور یہ دوربینی اور عاقبت اندیشی کے مرض میں گرفتار رہوتی ہے۔ عقل نے دنیا میں کبھی جرائت کے حیرت انگیز کرشمے نہیں دکھائے ہیں۔ لیکن عشق کی بدولت انسانوں کی تاریخ درخشاں اور منور کارناموں سے پر ہے ؎

عشق چوگاں باز میدان عمل　　عشق در پیچانِ اسباب و علل
عقل مکار است دامے می زند　　عشق صید از زورِ بازو افگند
عشق را عزم و یقین لاینفک است　　عقل را سرمایہ از بیم و شک است

لیکن اقبال عقل سے بالکل متنفر نہیں ہیں عقل کو وہ اپنے عزم و استقلال میں اتنا پختہ نہیں پاتے جتنا کہ عشق کو عقل ہر شے کو اپنی کسوٹی پر پرکھتی ہے، اور صرف اسی کو خوش آمدید کہتی ہے جو اس کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ عشق صرف سچائی وصداقت کا طلبگار رہوتا ہے، جہاں اسے یہ صفات مل جاتی ہیں وہ اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ عشق موقع شناسی اور معاملہ فہمی سے بالکل عاری ہے۔ وہ تو جذبہ کی قدر کرتا ہے اور بس۔ عقل، اور عشق کے فرق کو اس شعر میں دیکھئے ؎

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی　　پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل

عشق تو امروز و فردا سے بے خبر، نتائج سے بے خوف طعن و تشنیع سے بے پروا ہو کر وہ گزرتا ہے جو اسے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ؎

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی　　بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

اقبال عشق کو انسانی کمال کے لئے لازمی اور ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ ایمان ہے کہ عشق کے بغیر کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتی اس لئے کہ عشق سے یقینِ محکم پیدا ہوتا ہے اور یہی یقین محکم ہے جو تمام مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے ؎

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق سے انسان اور جماعتوں کو حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے، عشق دنیا میں دائم و قائم ہے اور اس کے کارنامے دلوں سے محو نہیں ہو سکتے ؎

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

عشق ہی سے خودی کی تخلیق ہے، اور خودی میں اس وقت تک زندگی نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اس میں عشق اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر نہ ہو۔ اگر آپ خودی کو ایک جسم قرار دیں تو عشق اس جسم میں بمنزلہ روح کے ہوگا اور ظاہر ہے کہ جسم اس وقت تک بیکار ہے جب تک اس میں روح کی کارفرمائی نہ ہو، اس لئے عشق اور خودی لازم و ملزوم ہیں۔ جب خودی اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے تو عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حق تو یہ ہے کہ دنیا کی تخلیق سراسر عشق ہی سے ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو شاید عالم کون و مکاں کا وجود نہ ہوتا، یہ عشق ہی کا کرشمہ ہے کہ جس نے ذرہ ذرہ کو سرشار محبت بنا رکھا ہے۔ ہر شخص میں اس کی جسارت اور استعداد کے مطابق برق کی طرح حرارت زندگی پیدا کرتا ہے۔ عشق کا پیغام صلائے عام ہے، اور محبت کی وحدت کا یہ حال ہے کہ ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

انسان اور عشق میں جو باہم باطنی تعلق ہے اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے

یقین ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اسے ہوس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ جذبہ خالص فطری جذبہ ہے۔ عاشق کی صحیح اور مکمل تعریف کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

عاشق آں نیست کہ لب آہ و فغانے دارد عاشق آنست کہ برکف دو جہانے دارد

عاشق آنست کہ تعمیر کند عالم خویش ورنہ سازد بہ جہانے کہ کرانے دارد

علامہ اقبال نے عقل کو کبھی اپنا پیشوا اور رہبر نہیں تسلیم کیا کہ عقل دل میں یقین و ایمان پیدا کرنے کے بجائے شک و شبہ پیدا کرتی ہے، لیکن عشق کہ وہ جذبِ اندرون اور بیبا کی پیدا کرتا ہے، اس لائق ہی ہے کہ انسان اسے اپنا رہنما قرار دے ؎

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

علامہ موصوف عشق کو فرزانگی اور دانشمندی سے دور رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اگر عشق میں عقل کی صفت پیدا ہو جائے تو اس سے دنیا بے رنگ و رونق ہو جاتی ہے اور زندگی کی بہار خزاں سے بدل جاتی ہے ؎

تہی از ہائے و ہو میخانہ بودے گل ما از شرر بیگانہ بودے

نہ بودے عشق و ایں ہنگامۂ شوق اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

بالِ جبریل کے ان اشعار میں ڈاکٹر صاحب نے عشق کے کمالات اور

عطیات کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے ؎

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی ‏ ‏ ‏ کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

ایک جگہ اور عشق کا کمال ظاہر کرتے ہیں ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ‏ ‏ ‏ اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

ایک دوسری جگہ عشق کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں ؎

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم ‏ ‏ ‏ عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

اقبالؔ اس شخص کو سچا مومن نہیں سمجھتے جس میں عشق کی کیفیات نہ پائی جائیں۔ چنانچہ نہایت اعلان کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ‏ ‏ ‏ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

لیکن عشق کو صادق اور باصفا ہونا چاہیئے، اگر کوئی طلب صادق کی روشن آگ میں مر جائے تو اس کی موت شہید کی موت سے کم قابلِ رشک نہیں ہے اس لئے کہ

عشق ہے مرگ باشرف، مرگ حیات بے شرف

جس قوم میں عشق رچ نہ گیا ہو اور جو جماعت عشق کی کیفیات سے وارفتہ نہ ہو وہ اقبالؔ کے نزدیک دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ عشق ہی سے قوم میں آثار حیات اور زندگی نو پیدا ہوتی ہے۔

ضربِ کلیم میں جو نظم "علم و عشق" کے نام سے ہے، اس میں علم و عشق کا فرق بہت ہی واضح اور نمایاں طور سے بیان کیا گیا ہے ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن ‏ ‏ ‏ عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن ‏ ‏ ‏ عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات ‏ ‏ ‏ علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات ۔ علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
شرح محبت میں ہے عشرت منزل حرام ۔ شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام ۔ علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

غرض اقبالؔ نے عشق کو زندگی کی متاع بے بہا قرار دیا ہے۔ وہ اس کو ایسا آب رحمت سمجھتا ہے، جس کے بغیر زندگی کی کھیتیاں سرسبز و شاداب نہیں ہوتیں۔ سچے عشق کی تڑپ اور خلش اگر دل میں نہ ہو تو دل گوشت و خون کا ایک لوتھڑا ہے جس میں زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ جب تک دل عشق کی آگ سے شعلہ نوا نہ ہو زندگی میں کیف و رنگ نہیں پیدا ہوتا۔ عقل کی رہبری بھی زندگی کے مسائل حل کرنے میں مدد دیتی ہے لیکن اس کو آپ حق و باطل کے پرکھنے کی کسوٹی نہیں بنا سکتے۔ کسوٹی تو حق پسند دل کی وہ آواز ہے جو نیک و بد میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ اگر انسان دل کی اس آواز کو سُننے کے لئے گوش پیدا کرلے تو وہ فطرت کا بڑا ادا شناس بن جائیگا۔

لیکن عشق اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ آرزو کا وجود نہ ہو، آرزو نہ ہو تو عشق کا ایک بیکار جذبہ ہے، جسکی کچھ قدر نہیں عشق آرزو ہی سے استوار اور دیرپا بنتا ہے۔ آرزو جتنی بلند اور روشن ہوگی اسی قدر عشق ہوا و ہوس سے بیگانہ ہوگا۔ عشق آرزو سے زندہ ہوتا ہے، اگر دل میں آرزو نہ ہو تو عشق کا روشن چراغ بھی بجھ جاتا ہے۔ عشق کی بقا آرزو کی بقا ہے اور عشق کا سوز آرزو کے قیام سے وابستہ ہے۔ آرزو اگر جاتی رہی تو انسان کی زندگی میں خزاں کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے دل کو سچی آرزوں اور تمناؤں کا آماجگاہ بنائے اور کبھی اس سوتے کو خشک نہ ہونے دے جس سے زندگی سیراب ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے آرزو کو زندہ رکھنے کی کثرت سے تعلیم دی

ہے۔ وہ شوپن ہار، اور گوتم بدھ کی طرح خواہش اور آرزو کو زندگی کے مضر عناصر نہیں سمجھتے، اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ زندگی یاس وقنوط سے عبارت نہیں ہے، بلکہ آرزو حیات انسانی کا وہ چراغ ہے جس سے زندگی کا ہر پہلو تابناک ہے۔ اسلام آرزو و تمنا کی تعلیم سے پُر ہے۔ رضائے الہٰی کی آرزو، خوشنودی رسول کی آرزو، جنت کی آرزو، زندگی نو کی آرزو آسمانی عطیات کی آرزو، دنیائے عمل کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی آرزو زندگی کو بامقاصد اور بامعنی بنانے کی آرزو، غرض آرزو کسی حالت میں "شجر ممنوعہ" نہیں ہے کہ انسان اس کے قریب جائے اور اپنے جرم کی پاداش میں، زمین کی آلائشوں اور ناپاکیوں میں بھیج دیا جائے۔ حضرت اقبال تو آرزو کو شانِ خداوندی سے بلند شے سمجھتے ہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی، دیگر نہ لوں شانِ خداوندی

شہید آرزو کے مرتبہ کو سنیئے ؎

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

مختصر یہ کہ اقبال کے نزدیک آرزو بغیر عشق ناممکن ہے اور عشق کے بغیر خودی بے حقیقت۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری یا فلسفہ میں کس آرزو کی تمنا کی ہے۔ اقبال کی آرزو ایک کامل انسان کے ظہور کی آرزو ہے۔ وہ اس عالمِ حقیقت میں ایک کامل انسان کو جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ایک مردِ کامل ہی اپنی نظر حکیمانہ اور سخن دل نواز کے سحر سے ایک جہان نَو پیدا کر سکتا ہے اور اپنے ضمیر پاک و نگاہ بلند سے آوارگانِ راہ کو فیضانِ نظر اور جذب دروں عطا کر سکتا ہے۔ پروفیسر میکنزی

نے صاحب جنوں کی ضرورت کو اپنے مندرجۂ ذیل فقرات میں یوں ظاہر کیا ہے۔

"کوئی اعلیٰ جماعت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اعلیٰ افراد نہ ہوں اور ان کو پیدائش کے لئے صرف وقت نظر ہی درکار نہیں بلکہ قوت متحرکہ بھی، صرف روشنی ہی نہیں بلکہ آگ بھی۔ موجودہ مسائل معاشرت کو محض نظری حیثیت سے سمجھ لینا ہمارے درد کا درماں نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ضرورت صرف علمائے مصلحین ہی کی نہیں ہے بلکہ رہبروں کی بھی ہے۔ ایسے رہبر جیسے کارلائل، رسکن اور ٹالسٹائے جو ہمارے ضمیر کو زیادہ سخت اور ادائے فرض پر زیادہ مستعد بنا سکیں بلکہ ضرورت تو ہمیں ایک جدید مسیح کی ہے۔ یہ قول بالکل صحیح ہے کہ اس جدید رہبر کو عملی دنیا کا رہبر ہونا چاہیے تاکہ اس کا پیام صدا بہ صحرا ہو کر نہ رہ جائے۔ دور حاضرہ کا صحرا ہمارے گنجان شہروں کی سڑکیں ہیں اور وہ مسلسل محاربات جن کے ذریعہ ہم فلاح کی راہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اس رہبر کی آواز کو ان جگہوں میں پہنچنا چاہیئے۔

"یا یوں کہیئے کہ اس دور جدید کے لئے ہمیں ایک جدید رہبر سے زیادہ ایک جدید شاعر کی ضرورت ہے، بلکہ ایک ایسے شخص کی جو رہبر بھی ہو اور شاعر بھی۔ حال کے شاعروں نے ہمیں فطرت کے ساتھ محبت کرنا سکھایا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں شانِ خدا کا جلوہ دیکھنا چاہیئے، لیکن ہمیں انتظار اس رہبر کا ہے جو اسی وضاحت کے ساتھ انسان میں شانِ

خدا کی جلوہ نمائی کی تعلیم دے اور راہبانہ ترک و تجرید کی بجائے اس عملی زندگی میں وہ نصب العین پیش نظر رکھے جس کے حصول میں ہمارے خیالات، افکار، جذبات اور تمنائیں سب کچھ وقف ہو جائیں اور جو ہمارے تزکیہ و تکمیل کا بہترین آلہ ہو۔"

اقبال کا بھی یہ خیال تھا کہ خاندانِ انسانیت کی باہمی رقابت، دشمنی تنازعات، اختلافات اور رخانہ جنگیوں کا استیصال معاہدوں اور صلح ناموں سے ممکن نہیں، اگر ان عالمگیر انسانی بیماریوں کو کوئی شے شفائے کلی بخش سکتی ہے تو وہ ایک ایسے حکیم و عارف کا وجود ہے جو اپنی شخصیت سے دلوں میں محبت و مودت کا ایسا جذبہ پیدا کر دے جو زوال آشنا نہ ہو۔

حضرت اقبال نے اپنے "کامل انسان" کو سرورِ کائنات کی ذات میں پالیا تھا سرورِ کائنات نہ صرف پیغمبر تھے بلکہ ان میں اخلاق و کردار کی وہ تمام بلند و برتر خوبیاں تھیں جو کسی فرد کامل میں ہونی چاہئیں۔ ایک مکمل انسان ہونے کی حیثیت سے رسول کا پیغام زمان و مکاں کی قید سے یکسر آزاد ہے۔ اس کی آواز صرف عرب کی چار دیواری تک نہیں محدود رہی بلکہ اس کا پیام دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا، اور اس شان سے پہنچا کہ دنیا ایک بار پھر روحانیت و نیکی کے نور سے بقعۂ نور بن گئی۔

اقبالؔ نے بھی رسولؐ کی طرح اپنا پیام عالمگیر رکھا ہے اور اپنے پیام کا سرچشمہ رسولؐ کی ذات کو بنایا ہے۔ اقبال رسولؐ اکرم

کی عزت و توقیر صرف اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے پیغمبر ہیں، بلکہ اس حیثیت سے قطع نظر، انھیں رسولؐ کی شخصیت سے والہانہ عشق اس لئے بھی ہے کہ وہ رسول کی ذات میں ایک کامل انسان جلوہ گر پاتے ہیں، اور انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اگر دنیا رسول کو انسانیت کا صحیح اور مکمل نمونہ سمجھے اور خود اسی رنگ میں رنگ جائے تو وہ امن و امان کا مسکن بن جائے گی۔ ہمارا شاعر رسولؐ کی تعلیمات میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر پاتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کے تمام فلاسفر، ادبا اور شعرا کے پیام میں نقص ہے، لیکن رسول کا پیام ہر جہت اور ہر رخ سے مکمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو رسول اکرم کی تعلیمات کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور بہ بانگ دہل کہتے ہیں کہ انسانیت کے درد کا درمان صرف رسول اکرم کی تعلیمات اور اسلامی نظام ہے، اگر دنیا اسے قبول کرلے تو آج دکھیاری اور مظلوم انسانیت پنپ سکتی ہے۔

علامہ موصوف کو جو شغف اسلامی نظام سے ہے اس کی بنا پر علمار مغرب و ہندوستان یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا پیام عالمگیر نہیں ہے اور انہوں نے صرف مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک اعتراض ڈکنس نے کیا تھا۔ معترض کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا تھا اس میں اسلامی نظام کی وجہ فوقیت بیان کی، یہاں وہ حصہ جس میں انھوں نے اسلام سے بحث کی ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

"مسٹر ڈکنس یہ فرماتے ہیں کہ مرے فلسفہ کے اصول اگرچہ عالمگیر ہیں لیکن ان کا دایرۂ اطلاق مختص و محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ خیال بلاشبہ

ایک معنی میں صحیح ہے شاعری اور فلسفہ میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر رکھا جاتا ہے، لیکن اس نصب العین کی تحصیل جب عملی زندگی میں کی جائے گی تو لامحالہ اس کا اندازہ کسی مخصوص جماعت سے کرنا ہوگا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو، اور جس کے حدود میں تبلیغ عملی و لسانی وسیع ہو سکتی ہو۔ یہ جماعت میرے عقیدہ میں "اسلام" ہے نسلی امتیاز جو اقوام کے اتحاد و اشتراک عمل کی راہ میں سب سے بڑا مانع ہے اس کی سب سے زیادہ کامیاب مخالف جماعت یہی رہی ہے۔ رنیان کا قول تھا کہ "اسلام اور سائنس باہم متناقض ہیں" فی الحقیقت اسلام اور امتیاز نسلی باہم متناقص ہیں، یہ اصول نسلی نہ صرف اسلام کا بلکہ عالم انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اس وسوسہ شیطانی کی بیخ کنی کرنا تمام محبان بنی نوع انسان کا فرض ہے میں نے جب یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے، دنیائے اسلام پر حاوی ہوتا جاتا ہے، اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے نصب العین کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت و قومیت کے پھندے میں پھنسے جاتے ہیں تو بحیثیت ایک مسلمان اور محب نوع انسان کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ارتقاء انسانیت میں انھیں ان کے اصلی فرائض پر توجہ دلاؤں اس سے انکار نہیں کہ اجتماعی زندگی کے ارتقا و نشو و نما میں قبیلہ وار و قومی نظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے اور ہنگامی ضروریات کے لئے مفید ہے اور اگر ان کی اتنی ہی کائنات تسلیم کر لی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں ہوں، لیکن جب انھیں ارتقائے انسانیت کی آخری و انتہائی منازل قرار دیا جاتا ہے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں۔

بے شبہ مجھے اسلام سے انتہائی شیفتگی ہے، لیکن میں نے آغاز کار کے لئے جمعیت اسلام کو منتخب کیا ہے۔ اس کی محرک کوئی قومی و وطنی عصبیت نہیں جیسا کہ مسٹر ڈکنس میری طرف منسوب کرتے ہیں، بلکہ محض عملی سہولتیں ہیں، اس لئے کہ دنیا کی مختلف جماعتوں میں صرف جماعت اسلام ہی مجھے اس غرض کے لئے سب سے زیادہ موزوں نظر آئی۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اسلام کے حدود ایسے تنگ بھی نہیں جیسے کہ مسٹر ڈکنس نے سمجھ رکھے ہیں۔ قرآن جس وقت خلائق عامہ کو اتفاق و اشتراک کے لئے صلائے عام دیتا ہے تو ان جزئی اختلافات کو بالکل نظر انداز کر کے کہتا ہے "قل تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم"۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ علامہ موصوف نے اسلام کو انسانیت کے لئے سب سے بہتر نظام اس لئے نہیں قرار دیا ہے کہ وہ ان کا مذہبی نظام ہے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے نسل و رنگ کے امتیاز کو مٹایا ہے اور خاندانی اور قبایلی تفاخر کو قابل نفرت ٹھہرایا ہے۔ اسلام کے اس پیغام سے عرب کو سب سے زیادہ دکھ پہنچا، وہ ہزاروں سال سے قبایلی و خاندانی حسبی و نسبی تفاخر کے بتوں کو پوجتے آئے تھے۔ جب اسلام نے ان سے کہا کہ تم میں سے کسی ایک کو دوسرے پر صرف اس لئے فوقیت نہیں حاصل ہے کہ وہ بنو ہاشم سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا خاندان عرب میں اپنی شان و شوکت اور دولت و ثروت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ تم آپس میں بھائی بھائی ہو، تمہارا مرتبہ اور تمہاری حیثیت ایک ہی، مگر ہاں وہ شخص سب سے بڑا بزرگ ہے جو سب سے زیادہ متقی، پرہیزگار

اور عبادت گذار ہو۔ اس کی عزت اس مقدس رشتہ کی وجہ سے ہے جو اس نے اپنے خالق سے جوڑا ہے۔ عربوں کے کانوں میں جب یہ عجیب آواز پڑی کہ آج سے دنیاوی حشمت و دولت، جاہ و عزت کی بنا پر کوئی قابل عزت نہ ہوگا تو وہ دل گرفتہ اور کبیدہ خاطر ہو گئے اور انھوں نے رسول کی مخالفت صرف اس لئے شروع کر دی کہ اس نے نسلی فخر و مباہات کے ان بتوں کو توڑنا شروع کر دیا تھا جو ان کے دلوں میں مدتوں سے گھر کئے ہوئے تھے۔

اسلام ساری انسانیت کے لئے پیغام لایا تھا، اور اس پیغام کے لئے ضروری تھا کہ وہ کالے، گورے آقا و غلام، جابر و مجبور، مفلس و دولتمند کے فرق کو بالکل مٹا دے، اور ہر انسان کی صرف اس لئے عزت کرنا سکھائے کہ خدا نے اسے انسانیت کے شرف سے مشرف کیا ہے۔

آج کے حالات میں آپ اسلام کی اس تعلیم پر غور کیجئے تو آپ اسلام کی دور بینی و عاقبت اندیشی کے قائل ہوں گے۔ آج دنیا نسل و رنگ کی وجہ سے کشت و خون کا مرکز بنی ہوئی ہے، قومی و وطنی عصبیت اتنی ترقی پا گئی ہے کہ ایک ملک کا انسان اپنے پڑوس کے ملک کے انسان سے نفرت کرنے لگا ہے، اور ایک جماعت دوسری جماعت کے خون کی پیاسی ہے۔ ہر قوم اپنا دبدبہ و رعب ساری دنیا سے تسلیم کرانے کے خبط میں مبتلا ہے۔ گوروں کو یہ فکر ہے کہ ساری دنیا کے کالے ان کی حکومت اور ان کے "قدرتی امتیاز" کے سامنے سر جھکا دیں۔ یورپ کی مہذب و متمدن قومیں اتنی "ایثار پیشہ" واقع ہوئی ہیں کہ وہ اپنی دولت و وقت صرف کر کے ایشا کی پست اور غیر ترقی یافتہ قوموں کو جدید علوم و فنون

سے روشناس کرانے کے شوق میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جارہی ہیں۔ جاپان کو یہ ضد ہے کہ کمزور وناتوان چین اس کی قوت کا لوہا مان لے اور خود کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔ انسانیت کا ایک بڑا خادم یعنی مسولینی جبشہ پر صرف اس لئے چڑھ دوڑا کہ جبشے کے بسنے والے ملک کی آب وہوا کی وجہ سے کالے واقع ہوئے ہیں، اس لئے اہل روما کا یہ فرض تھا کہ وہ انھیں اپنی برادری میں شامل کر لیں۔ اہل جرمنی یہ سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا پر کشور کشائی کا حق صرف انھیں کو حاصل ہے اس لئے ان کا یہ فرض ہے کہ وہ آس پاس کی تمام ریاستوں کو ہضم کر لیں۔ ہمارے مہربان دوست انگریز ہندوستان میں دوسو برس سے صرف اس لئے تشریف فرما ہیں کہ ہندوستانیوں کو یورپی تہذیب سے آشنا کریں اور انھیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھائیں۔

غرض ساری دنیا میں عجیب ہنگامہ برپا ہے۔ ہر شخص اپنی برتری منوانا چاہتا ہے اور دوسروں کو حقیر وذلیل سمجھنے میں دلی تسکین پاتا ہے۔ انسانیت ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور انسانوں کی عام برادری علیحدہ علیحدہ جغرافیائی حدود میں بٹ گئی ہے۔

فوقیت وبرتری کا یہ خبط مغرب سے چل کر ہندوستان پہنچا، ہندوستان کے بسنے والے بھلا اس رو سے جو ساری انسانیت کو بہالے جانے کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے، کیسے بچ سکتے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ "وطنیت" کا بت یہاں بھی زور شور کے ساتھ پوجا جانے لگا۔ ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی ادب، ہندوستانی رسم ورواج اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہندوستان نے ساری دنیا کو جب کہ وہ جہل ولاعلمی کی تاریکی میں گرفتار تھی علم وادب

یا فلسفہ و منطق سے روشناس کرایا۔ ہندوستانی تہذیب نے مشرق و مغرب کی تہذیبوں کو مالا مال کیا۔ ہندوستان دنیا میں بہت پرانا مہذب و متمدن ملک ہے۔ ساری دنیا نے یہاں کے علوم و فنون سے خوشہ چینی کی، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کی عزت و وقار کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہادیں، اور ہندوستان کی فوقیت کو ثابت کرنا اپنا مذہبی فریضہ بنالیں۔

غرض یہ اور دوسرے خیالات تھے جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان خیالات کو نوجوانوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ملک کے ہزاروں نوجوانوں نے ہندوستان کی عزت کو قائم رکھنے میں اپنی جانیں قربان کردیں۔ سینکڑوں نغمے اور نظمیں ہندوستان کی شان میں لکھی گئیں اور اس جوش وخروش سے پڑھی گئیں کہ ایک مرتبہ سارا ہندوستان ان کی آواز سے گونج اٹھا۔

وطنیت کا غلغلہ کچھ اس انداز سے بلند ہوا کہ ہمارا شاعر بھی بیساختہ پکار اٹھا۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا"

اقبال کا یہ نغمہ سارے ہندوستان میں گایا جانے لگا، ہزاروں اخبارات و رسائل میں چھپا اور لاکھوں انسانوں کی زبان پر مدت تک رہا، جب وطن کے صلہ میں اسے "قومی شاعر" کا خطاب ملا، اور اس کی غیر معمولی قدر و عزت کی جانے لگی ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہمارا قومی شاعر انگلستان گیا۔ لیکن جب اس نے وہاں انسانی زندگی کے تمام حسن و قبح خود اپنی نظر سے دیکھے، یورپ کے قومی مسائل پر غور کیا، دنیا کے تمام حالات کا جائزہ لیا اور قوموں کے ترقی و تنزل کے

فلسفہ پر گہری نظر ڈالی تو اس پر یہ راز کھل گیا کہ انسانیت کی فلاح قومی اور وطنی عصبیت اور نسلی و ملکی تفاخر میں نہیں ہے اور اگر وطنیت کے تخیل نے جڑ پکڑ لی تو یہ انسانیت کے لئے تباہی کا باعث ثابت ہوگا۔

یورپ کے قیام سے اقبال کی شاعری میں بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ یورپی تہذیب کو جب انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تو اس کی ساری خرابیاں ان پر عیاں ہو گئیں اور وہ اہل یورپ کی ظاہری ترقی و کامیابی سے بڑی حد تک مایوس ہو گئے۔ یورپ کے عام حالات سے جو انھیں مایوسی ہوئی تھی، اس کی طرف انھوں نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

مدیر مخزن سے جا کے کوئی پیام اقبال میرا کہدے ۔۔۔ جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

یورپ کے وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد جب اقبال ہندوستان واپس آئے تو وہ "قومی شاعر" نہیں رہ گئے تھے اور انھوں نے اپنا وطن صرف ہندوستان کو نہیں قرار دیا تھا بلکہ

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

ان کے دل میں صرف ہندوستان اور ہندوستانیوں کی عزت باقی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ ساری دنیا اور ساری انسانیت سے انھیں شغف اور محبت پیدا ہو چکی تھی۔ صرف اپنا تمدن اور اپنی تہذیب نہیں پسند تھی بلکہ وہ ہر تہذیب و تمدن میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور پاتے تھے۔ صرف اپنا ادب اور اپنی منطق و حکمت ہی نہیں محبوب تھی بلکہ دنیا کے ہر ادب و فلسفہ میں ان کے لئے دلکشی تھی، صرف اپنے ہی ملک کا ماضی درخشاں نہیں سمجھتے تھے، بلکہ چین و عرب، مصر و بابل کا ماضی بھی ان کی نظر دن

میں منور تھا غرض وہ وطنیت کے تنگ دائرے سے نکل کر انسانیت کے وسیع میدان میں داخل ہوگئے تھے، اور اب ان کا زورِ قلم صرف ملک کی خوبیاں اور اوصاف لکھنے تک محدود نہیں تھا بلکہ ساری دنیا اور عالم انسانیت کے صفاتِ محمودہ بھی ان کا کلک گہر بار رقم کرتا تھا۔ انسانوں کو خانوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ سارے جہاں کے انسانوں کو اخوت و محبت کے عام رشتہ میں جوڑنا چاہتے تھے، اب انہیں مکان سے محبت نہیں رہ گئی تھی بلکہ ان کا دل مکین کی مئے الفت میں سرشار تھا۔

غرض یہ خیالات تھے جن پر اقبالؔ نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور اپنی زندگی کا منتہائے نظر انسانیت کی خدمت بنایا۔ ان کا ہر شعر محبت نوعِ انسانی کا پیغام اپنے اندر رکھتا ہے۔ انھیں اسلام سے بھی اسی لئے شغف ہے کہ وہ نسلی امتیازات کو یکسر مٹانا چاہتا ہے۔ نفرت و حقارت کی وہ آگ جو آج ہر قوم اور ہر ملک کے خرمنِ حیات کو جلائے ڈال رہی ہے، صرف اس صورت میں بجھ سکتی ہے کہ دنیا اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ آج ہزاروں انسان انسانیت کے شرف سے صرف اس لئے محروم کر دیئے گئے ہیں کہ وہ دولت و ثروت کے مالک نہیں ہیں لیکن اسلام، ان کو اپنے گوشۂ عافیت میں پناہ دینے کے لئے تیار رہے کہ اس کے یہاں برتری و تفوق کا معیار دنیاوی کامیابیاں نہیں ہیں بلکہ عقبیٰ کی سرفرازیاں ہیں جو تقویٰ و نیکی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اقبالؔ نے دنیا کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو اس محبت کی بنا پر پیش کیا ہے جو انھیں عام انسانیت

سے بھی اور ان کا یہ ایمان تھا کہ اگر دنیا کی قومیں تعصب اور تنگ نظری کی عینک اتار کر اسلامی تعلیمات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو انھیں اپنے درد کا درماں اس میں ملے گا۔

اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ خونریز مذہب ہے اور جہاد کے پردے میں ساری دنیا کو اپنی تلوار کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ غالباً یہی غلط فہمی ہے جس کی بنا پر ایشیا و یورپ نے اسلامی تعلیمات پر کبھی توجہ نہیں کی ہے۔ اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے علامہ موصوف نے جو خط ڈکنس کو لکھا تھا اس کا وہ حصہ قابل توجہ ہے جس میں انھوں نے اسلام کے وطنی تخیل کو پیش کیا ہے، اور اس کی رواداری و وسیع النظری کی تعریف کی ہے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو ایک خوں ریز مذہب سمجھنے کا جو متعصبانہ خیال یورپ میں زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے وہ ڈکنس صاحب کے سر پر بھی سوار ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ کافۂ انام اسلامی عقیدہ کی رُو سے آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق ہے، بشرطیکہ نسل و قوم کے اصنام کو توڑ دیا جائے، اور ایک دوسرے کی خودی یا انام کو تسلیم کر لیا جائے۔ مجالس اقوام، حکم برداریاں، صلح نامے اور فرامین شاہی، خواہ ان میں جمہوریت کا رنگ کتنا ہی بھرا جائے، کسی طرح باعث فوز و فلاح نہیں بن سکتے۔ انسان کی فلاح صرف اس میں ہے کہ سب کو بالکل مساوی اور آزاد سمجھا جائے۔ ضرورت اس کی ہے کہ سائنس کا مصرف جواب تک دنیا کی ویرانی و بربادی میں ہوتا رہا ہے سرے سے اُس کو الٹ دیا جائے اور مخفی سیاسیات کو جس کا مقصود اب تک صرف اس قدر رہا ہے کہ وہ قومیں جو زیادہ طاقتور اور ہشیار نہیں، انہیں برباد کر دیا جائے، اب ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا جائے۔

بیشک دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں نے بھی جنگ جوئی وتسخیر ممالک سے کام لیا ہے، اور مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ ان میں بعض نے اپنی ذاتی حرص و ہوس کو جامہ مذہب پہنایا ہے. با ایں ہمہ میں اذعان کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ملک گیری عقاید اسلام میں ہر گز داخل نہیں، بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات اور کشورکشائیوں ہی نے اس مبارک نظام جمہوریت و معاشرت کے نشو و نما کو روک دیا جس کی تخم ریزی قرآن و احادیث نبوی کے صفحات میں کی گئی تھی. یہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کر لیں، لیکن اس کے لئے انہیں اپنے بعض اہم ترین اصول قربان کرنے پڑے اور اسلام کے سیاسی مطمح نظر پر قدیم مشرکانہ رنگ پھر دوڑ گیا۔ اسلام بیشک دوسروں کو اپنا جزو بنانے کے لئے آیا ہے، لیکن کیونکر؟ ملک گیریوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ تعلیمات کی سادگی، اپنی تعلیم کی موافقت عقل سلیم اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بیگانگی کی بنا پر. چین میں محض دعوت و تبلیغ کے اثر سے آج لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ بغیر کسی جبر و اکراہ اور سیاسی قوت شمول کے بھی اسلام بخوبی پھیل سکتا ہے. میں نے بیس برس سے زائد دنیا کے فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بنا پر رائے قائم کرنے میں بے تعصبی برت سکتا ہوں، میری فارسی مثنویوں کا مدعا اسلام کی وکالت نہیں بلکہ مقصود صرف اس قدر تھا کہ دنیا کے سامنے ایک عالمگیر نصب العین کا خاکہ تیار کرتے ہوئے مجھے ناممکن معلوم ہوا کہ اس نظام معاشرت کو سرے سے نظر انداز کر جاؤں جس کی

غایتِ وجود یہ ہے کہ ذات پات، دولت و مرتبہ اور نسل و قوم کے امتیازات کو مٹایا جائے اور جس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک طرف معاملات دنیوی کو بھی برتا جائے اور دوسری طرف انسان معاملات میں اغراض دنیاوی سے قطع نظر کر کے محض احکام الٰہی پر نظر رکھے۔ یورپ اس قدیم تعلیم سے بیگانہ ہے، یہ درس ہم اس کو دے سکتے ہیں۔

اقبالؔ اسلامی تعلیمات کو اس لئے بھی دنیا کی مصیبتوں کا حل سمجھتے ہیں کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو حقیقی مادی زندگی سے گریز نہیں سکھاتا بلکہ اخلاقی اقدار و مقاصد کی طرف دعوت دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح وہ اپنے پیروؤں کو آفاق میں گم ہو جانے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ آفاق کو خود میں جذب کرنے کی ہمت دلاتا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اسلام بدھ مت اور عیسائیت کے برخلاف تسخیر فطرت، عمل پیہم اور حرکت دوام کی پر زور تعلیم دیتا ہے۔ اور اسلام کی یہی تعلیم ہے جو اسلامی جماعت میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ تاریخ عالم کی دیگر قوتوں کے ساتھ اپنا رشتۂ اتحاد جوڑے۔ اسلامی تہذیب میں وہ تمام مقاصد انسانی پوشیدہ ہیں جن سے ساری انسانیت کرب والم کی مصیبت سے نجات پا سکتی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک اسلام کی ایک اور خوبی سے انسانی زندگی میں توازن و تناسب پیدا ہو سکتا ہے، اور وہ خوبی اس کی میانہ روی ہے۔ اسلام کی یہ شروع ہی سے خصوصیت رہی ہے کہ اس نے انسانی معاملات میں ہمیشہ درمیانی راستہ اختیار کیا اور انتہا پسندی اور غلو سے گریز کیا کہ ایسا کئے بغیر تمدنی ہم آہنگی محال ہے۔

اقبال یورپ کی موجودہ تہذیب سے بیزار ہیں، لیکن وہ اس کی علمی ترقیوں کو بڑی حد تک پسند کرتے ہیں، کیونکہ ان کو آگے چل کر بقار انسانی کا ضامن بنایا جا سکتا ہے۔ یورپ پر ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے مادیت کو مقصود بالذات بنا لیا ہے اور مادی زندگی کی قدر و قیمت میں بہت غلو برت رہا ہے۔ اس غلو کو وہ روح اسلامی کے منافی سمجھتے ہیں۔ اقبال مادیت کو مقصد نظر بنانے کے اس لئے خلاف ہیں کہ اس سے شرف انسانیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اہل یورپ ذہنی تربیت میں اس قدر منہمک ہیں کہ انھوں نے غریب دل کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کی نظر ہر شے کے ظاہر پر پڑتی ہے اور باطنی پہلو نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یورپی تہذیب نے تن آسانی اور تن پروری پر اتنا زور دیا ہے کہ روحانیت کے تمام سوتے خشک ہو گئے ہیں اور زندگی کی سرسبزی و شادابی جاتی رہی۔ اقبال صرف اسلام کو ایک ایسا نظام زندگی تصور کرتے ہیں جو روحانیت اور مادیت کا بہترین امتزاج پیش کرتا ہے اور دنیاوی زندگی برتنے کا وہ درمیانی راستہ بتاتا ہے جس پر چل کر روح و مادے کے تقاضے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ دل بھی روشن اور منور ہو اور روح بھی رسا اور تیز، ورنہ صرف خالص مادی بنیادوں پر کسی تہذیب کی فلک بوس عمارت عرصہ تک پائیداری کے ساتھ نہیں کھڑی ہو سکتی۔ یورپ کے متعلق تو انھوں نے اپنے اس مصرعہ میں پیشین گوئی کر دی ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی

مختصر یہ کہ ان اسباب کی بنار پر اقبال اسلام کو تمام نظامات سے بہتر تصور کرتے ہیں اور انسانیت کے دکھ درد کا مداوا اسلام ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس یقین کی بنار پر وہ ساری انسانیت کو اسلام کے اصول وتعلیمات قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ موجودہ عہد کے تمام نسلی و قومی اختلافات مٹانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ طاقتور اور مہذب قومیں اسلام کے بنیادی اصول پر غور کریں اور اگر تعصب و محدود نگہی حایل نہ ہوں تو زندگی میں برت کر دیکھیں۔

علامہ اقبال جب اسلام کا نام لیتے ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا پیام صرف مسلمانوں کے لیئے ہے، بلکہ اسلام کو تو وہ دُنیا کے سامنے بہترین تمدنی نظام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، گویا وہ اسلام کو مذہبِ انسانیت سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں تو وہ گویا سارے انسانوں کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں۔

غرض یہ کہ اقبال انسانیت کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ نسلی و ملی امتیازات کو بالکل ختم کر دینا چاہیئے، اخوت و بھائی چارہ کی وہ مثال قائم کرنی چاہیئے جو مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ نے پیش کی تھی۔ آقا و غلام کی تمیز اُٹھ جانی چاہیئے کہ یہ تمیز فسادِ آدمیت ہے۔ اتحاد و اتفاق کی ایک ایسی فضا پیدا کرنی چاہیئے جس میں انسان ایک بلند و بالا مقصد یعنی نیابت الٰہی کے قیام کو نہ بھولے۔ یک رنگی و یک جہتی کی وہ کیفیت پیدا ہو جس میں ہر فرد اور ہر جماعت اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحتیں دنیا کی عام ترقی و خوش حالی میں صرف کر سکے۔ دنیا شر و فساد قتل و غارت، وحشت و بربریت اور کشت و خون کا مرکز نہ بنے

بلکہ امن و سکون اور اطمینان اور شانتی کا مسکن بن جائے۔ فرد اپنے کمال کو پہنچ کر فرد یکتا (خدا) میں گم ہو جائے۔ انسانوں کی قوت و طاقت ایک دوسرے کو مغلوب و محکوم کرنے میں نہ صرف ہوں، بلکہ عام انسانیت کی خدمت کا مقدس کام ان کے ذریعہ انجام پائے۔

اقبال انھیں خوش آئند توقعات کو عملی صورت میں دیکھنے کے لئے ایک مکمل انسان کے منتظر تھے۔ یہ کامل انسان ایک دوسرے کامل تر انسان یعنی رسولؐ اکرم کے اسوہ حسنہ اور اسلامی تعلیمات کی مدد سے دنیا کو امن و سلامتی کا ایک ایسا گلشن بنا دے گا جس کے پھول اپنے رنگ و بو سے دنیا کو ہمیشہ معطر رکھیں گے اور کبھی خزاں نصیب نہ ہوں گے۔

خودی اور اقبالؔ

بشیر احمد صاحب انصاری۔ بی۔ اے

بخود گم شو نگہ دار آبروئے عشق بازی را

ایک مستقل تڑپ، ایک پیہم خلش اور ایک نہ فنا ہونے والا احساس خودی سرمایۂ حیات ہے اس انسان کا جو وجہِ تخلیق کون و مکان کہلاتا ہے اور خلاقِ فطرت نے اس کی روحانی اور جسمانی دونوں زندگیوں کے لئے یہی پسند بھی کیا ہے۔ یہ ہے وہ عقیدہ جو اقبال کے تمام کلام کا خلاصہ اور نچوڑ کہا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں کامیابی کا راز زندگی کی جس کیفیت میں مضمر ہے، وہ "خودی" اور اس کا لازمہ سوز و ساز ہے۔ حیات کے ہر پہلو پر اس عقیدے کو چھایا ہوا ہونا چاہیئے۔ جلال و جمال کی کیفیتیں اگر بیک وقت کہیں پہچانی جا سکتی ہیں تو وہ اسی عقیدے کے حامل میں پہچانی جا سکتی ہیں۔

چنانچہ اسی ایک عقیدے اور ایک خیال کو اقبالؔ نے جگہ جگہ اپنے کلام میں نئے نئے عنوانات سے دہرایا ہے۔

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور — کہ جان تو ز خود نا محرمے ہست۔

قدم در جستجوئے آدمے زن — خدا ہم در تلاش آدمے ہست

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ — زبیمش زرد مانند زریری
بخود باز آ خودی را پختہ تر گیر — اگر گیری، پس از مردن نمیری

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود — خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگریستم من — کران بیکراں در من نہاں بود

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی ؟ — کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

دل از منزل تہی کن پا برہ دار — نگہ را پاک مثل مہر و مہ دار
متاع عقل و دیں با دیگراں بخش — غم عشق ار بدست افتد نگہ دار

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

میان آب و گل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بچشم خود ندیدم

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب — حقیقت در مجازش بے حجاب است

زخاک تیرہ می روید ولیکن نگاہش بر شعاعِ آفتاب است

دوام ما زسوز ناتمام است چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل تپید یک دم و مرگ دوام است

مگر خودی کی تکوین وتعمیر اور "خودی" کی محسوس اور موجود شکلوں کے اقرار اور انکار میں جتنا اختلاف چلا آرہا ہے، اتنا شاید انسان کے کسی دوسرے حس کے متعلق نہیں پایا جاتا۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں اور جتنے خیال اتنی ہی رائیں۔ ہر ایک اپنی دلیل میں مضبوط اور اپنے خیال میں اٹل معلوم ہوتا ہے۔

ایسی الجھی ہوئی بحث اور ایسے نازک مسئلے پر کچھ کہنا اور پھر کسی گروہ کی تردید کرنا بہت ہی مشکل بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ذیل میں جو کچھ کہا جائے اور جتنا کہا جائے، وہ بحث ہی کو اور زیادہ الجھانا ہوگا۔ انسانی طبیعت کی ان سیمابی کیفیتوں کو جو مضطرب بھی ہیں اور منتشر بھی، کسی ایک نقطے پر نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن اسی کے ساتھ خاموش رہنا بھی ممکن نہیں۔ روح کی اس داخلی زندگی کو سمجھنا اور سمجھانا انسانیت کے عروج و زوال کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ قوموں کا بننا اور بگڑنا، ابھرنا اور ڈوبنا، افراد کا جماعت اور جماعت کا فرد میں مدغم ہو جانا "خودی" کے اعتراف یا انکار میں مضمر ہے۔ میرے خیال میں اگر اقبال ایسے اہم اور ضروری مسئلہ کو محض دقیق الجھنوں اور اسی کے ساتھ بات کی پیچیدگیوں سے ڈر کر نظر انداز کر جاتے تو صرف کھلی ناانصافی ہی نہ ہوتی بلکہ اقبال

کو اقبال بننا بھی نصیب نہ ہوتا۔

جو لوگ خودی کے منکر ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ خودی نام ہے انسانی طبیعت کی سرکش قوتوں کا دلیل اس کی یہ ہے کہ زندگی کی یہ کشاکش جس میں دغا فریب، ظلم اور ناانصافی کا ہاتھ زیادہ تیزی اور زیادہ قوت کے ساتھ کام کرتا ہے، انسان کی اسی سرکش طبیعت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک دلیل کا تعلق ہے بات معقول ہے اور سمجھ میں بھی فوراً آجاتی ہے۔ واقعی اگر دنیا کے اجزار ترکیبی کا جائزہ لیا جائے تو چیرہ دستیوں اور خوں آشامیوں، خود غرضیوں اور خود پرستیوں کے سوا، یا تو تمام دوسرے اجزار کا پتہ ہی نہ چلے گا اور اگر ہوں گے بھی تو انہی میں ملے چلے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فلسفیوں کا ایک گروہ متفقہ طور پر دنیا کو پامالیوں اور بدحالیوں کا مرکز اور بربادیوں اور بدکاریوں کا منبع قرار دیتا ہے اور اسی سے ڈر کر محتاط لوگ خلوت گزینی اور رہبانیت کی راہ اختیار کرتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں اس عقیدے کو جتنا پھلنا پھولنا نصیب ہوا، اتنا شاید اور کہیں بھی نہیں ہوا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے رشی اور منی جنھیں وہ اپنا رہنما اور دیوتا مانتے ہیں، اسی کا پرچار کرتے تھے۔ سنسار کو تیاگنا اور کسی پہاڑ کی کھو میں منہ چھپا کر بیٹھ رہنا ان کے یہاں عبادت کا اب بھی سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے اس فلسفے میں یہ لوگ یہاں تک بڑھے کہ کسی نے درخت پر لٹک کر زندگی گزار دی، کوئی ایک ٹانگ پر برسوں کھڑا رہا، کسی نے اپنے آپ کو اس طرح چھپایا کہ پھر کسی نے اس کا پتہ نہ پایا۔ غرض طرح طرح کی

ریاضتوں سے اپنی جان ہلکان کی اور اسی میں نجات ابدی کا راز مضمر تھا۔

ہندوستان کے مسلمان بھی اپنی ہمسایہ قوم کے اس انوکھے اور غیر فطری فلسفے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اتفاق سے ان کے یہاں بھی ریاضت نفس کی تعلیم دی گئی تھی، اس کی آڑ پکڑ کر انھوں نے رہبانیت اور ترک دُنیا کے فلسفے کو خوب سراہا اور اس تعلیم کو اخلاق کا ایک جزو لاینفک قرار دے دیا۔ امکان نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ انھوں نے دیوتا بننے کی کوشش تو نہیں کی لیکن اپنے آپ کو دیوتا کا ہمسر ضرور بنا دیا۔

اقبال نے اس غیر اسلامی تعلیم کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اس نے صاف صاف کہا کہ ان باتوں سے اسلام کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اور واسطہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، اسلام تو آب و گِل کی اس دنیا میں بسنے والے گوناگوں خواہشوں اور لامحدود تمناؤں کے حامل انسان سے اپنا تعلق پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ نئی دنیا بسانا چاہتا تھا مگر الگ نہیں، چنانچہ اس نے انسانی قوتوں کی چھان بین کی اور جو اہلیتیں اس میں موجود تھیں انہی سے اس کی زندگی کا ایسا سانچہ تیار کیا جس میں کوئی کور کسر باقی نہ رہی اور بقول اقبال ؎

سفالم را مۓ او جام جم کرد ‏ ‏ درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بت خانہ ریخت ‏ ‏ خلیل عشق دیرم را حرم کرد

اقبال نے کہا اسلام دنیا میں وہ پہلا نظام زندگی ہے جو آدمی کو نہ تو فرشتہ بنانا چاہتا ہے اور نہ حیوان، وہ صرف ایسا انسان بنانا چاہتا ہے جو اپنی ملکوتی اور حیوانی اہلیتوں کو اعتدال سے استعمال کرتا ہو، اور اس میں وہ جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے وہ اپنی ہستی پر ناز کر سکے، اسی لئے

اسلام "خودی" کو انسانی احساسات کا سب سے اعلیٰ جوہر قرار دیتا ہے۔ طبیعت کی یہی سرکش قوتیں جن کے بوجھ سے گھبرا کر ہندو فلسفی خود کشی پر مجبور ہو گیا، اسلام کے نزدیک انسانیت کی بقا اور ترقی کے لئے لابد اور ضروری ہیں ؎

گفتم کہ شر بفطرتِ خامش نہادہ اند　　گفتا کہ خیر او نشناسی، ہمیں شر است

البتہ ان قوتوں کی تربیت کے لئے چند قوانین ضرور بنا دئے گئے ہیں تاکہ وہ بے کار کاموں میں صرف ہو کر اکارت نہ جائیں۔ اسلام میں سرکشی اور بغاوت بری بات ہے، مگر خدا کے ساتھ اس کی نظر میں جھکنا گناہ ہے، مگر موجودات کے سامنے۔ مختصر یہ کہ آدمی نہ تو خدائی کا دعویٰ کرنے والا فرعون بن جائے اور نہ حیوانات، نباتات اور جمادات کے سامنے جھک جانے والا ذلیل حیوان ؎

من نہ گویم کہ فرو بند لب از نکتۂ شوق　　ادب از دست مدہ، بادہ باندازہ بنوش

اقبال نے بتایا کہ اسلام کی نظر میں دنیا کی ہر چیز انسان کی غلام ہے اور انسان اس پر مطلق العنان حاکم۔ آسمان اور زمین کے بیچ میں جو کچھ ہے وہ انسان کا ہے اور اسی کی خدمت کے لئے اس تمام کائنات کو بنایا گیا ہے چنانچہ مسلمان جب تک اس تعلیم پر چلتے رہے خلافت کبریٰ کے مالک رہے، انسانی عظمت و شرف ان پہ ناز کرتا تھا مگر جب انھوں نے اس سے منھ موڑا اور خودی کو خود پرستی کا مترادف قرار دے کر انسانی روح کے لئے لعنت خیال کیا تو وہ گر گئے اور ایسے گرے کہ شاید پھر کبھی نہ اٹھ سکیں۔ خلافت کبریٰ کے یہ علم بردار، انسانی عظمت و غرور کے یہ پاسبان، اور موجوداتِ عالم کے یہ مطلق العنان فرماں روا فرماں بردار

ہو گئے، دنیا کی ذلیل ترین قوتوں کے غلام ہو گئے، ظالم اور نفس پرست انسانوں کے۔ ان کا وہ آئین جہاں داری اور دستور جہاں گیری ورق ورق ہو کر بکھر گیا۔ وہ قوم کہ فلک الافلاک پر جس کا ڈنکا بجتا تھا اور قلمروِ انسانی میں جس کا سکہ جاری و ساری تھا، ماضی کی ایک داستانِ پارینہ ہو کر رہ گئی "خودی" اور "انانیت" کے فقدان کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ یہی قانون فطرت ہے اور یہی آئین قدرت۔

اقبال نے اس راز کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس نے اپنی قوم میں "خودی" اور "کاوش پیہم" کا ایک مستقل جذبہ پیدا کرنا چاہا۔ لیکن غلامی کی لعنت میں گرفتار مسلمان کو جنبش تک نہ ہوئی۔ پھر بھی اقبال نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اپنی زندہ درگور قوم کا مرثیہ خواں بنا۔ اور بساط بھران کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو باد مخالف کے تلاطم خیز تھپیڑوں اور ناامیدی کے سمندر کی اژدہا پیکر موجوں سے بچالے جانے کی کوشش کی۔ خودی کے اس متوالے نے پکار پکار کر کہا ؎

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم لوح دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کنیم

قدرت اپنے قوانین میں ہمیشہ سے اٹل رہی ہے۔ اس نے ہر گرتی ہوئی قوم کو سنبھالنے کی کوشش کی ہے، بشرطیکہ اس میں صلاحیت پائی ہو۔ اس کی یہ کوشش آج بھی اسی طرح اپنا یہ فرض انجام دے رہی ہے۔ چنانچہ غلامی کے اس خراب آباد میں اس نے اقبال جیسا رند بلاکش اپنا ازلی اور ابدی پیغام دے کر بھیجا۔ وہ آیا اور ڈنکے کی چوٹ مشرق سے مغرب تک یہ کہتا ہوا پھر گیا ؎

درسرائے ہست و بود آئی، میا ازعدم سوئے وجود آئی؟ میا

دربیائی، چوں شرار، از خود مرو — در تلاش خرمنے آوارہ شو
تاب و تب داری اگر مانند مہر — پا بنہ در وسعت آبادِ سپہر!
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز — ماہیاں را در تہہ دریا بسوز
سینۂ داری اگر در خوردِ تیر — در جہاں شاہیں بزی، شاہیں بمیر
زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات — از خدا کم خواستم طول حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش — یک دم شیری بہ از صد سال میش
زندگی محکم ز تسلیم و رضاست — موت نیرنج و طلسم و سیمیاست
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقام اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثل شاہینے کہ افتد بر حمام
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ — زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شائے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگ آزاداں زآنے بیش نیست
بگذر از مرگے کہ سازد با لحد — زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد
مرد مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ انتہائے راہ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہ شوق
جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است — جنگ مومن سنت پیغمبری است.
جنگ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست — ترک عالم، اختیار کوئے دوست
آں کہ حرفِ شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانئ اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را — کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

پس چہ باید کرد

پروفیسر سید نواب علی صاحب

ڈاکٹر محمد اقبال نے وفات سے دو سال پیشتر مولانا رومؒ کی شہرۂ آفاق مثنوی کی پیروی میں پانسو اشعار کی ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی جو ان کے افکار عالیہ کا ایک صاف و شفاف آئینہ ہے۔ مولوی معنوی کی مثنوی کی طرح اس میں بھی وہی جوش وہی سوز اور وہی تخیل ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا "زبان پہلوی کے قرآن" کا سورۂ اخلاص ہے۔ مرحوم نے پہلے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں کتاب پڑھنے والے سے یوں خطاب ہے۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق | کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است
زمانہ ہیچ ندا اند حقیقت او را | جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است

اقبال کو مغرب زدگی کا تلخ تجربہ تھا، وہ خوب جانتے تھے کہ مستشرقین یورپ نے ہمارے نوجوان و کاترہ میں کس طرح معلم املکوتی ذہنیت پیدا کردی ہے۔ اس ذہنیت کے نشہ میں وہ اسلامیات کو تقویم پارینہ سمجھنے لگے ہیں اور علوم و فنون جدیدہ کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ خرد کے باغیانہ خیالات ہیں جس کی مدافعت کے لئے حکیم قوم عشق کی ولایت سے ایک نئی فوج لاتا ہے جس میں وہ جنون سرگرم عمل ہے جس نے ہسٹر

محمد علی آکسن کو مولانا محمد علی جوہر بنا کر زندۂ جاوید کر دیا اور جس نے خود ڈاکٹر اقبال کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بنا دیا۔ اب مثنوی کا آغاز ایک تمہید سے ہوتا ہے جس میں "پیر رومی مرشد روشن ضمیر" کی روح پر فتوح یوں خطاب کرتی ہے۔

"اقبال! تو فرنگ کی آتش نمرود میں بیٹھ چکا ہے اب خلیل اللہ کی طرح اٹھ اور جہل و علم کے جتنے بت ہوں، ان سب کو 'جنون ذوفنون' کے جوش میں توڑ ڈال، اس لئے کہ تیرے زمانہ میں 'رمز جان' سے آگاہی نہیں ہے اور غیر اللہ کی محبت کو دین کہنے لگے ہیں، اب تو 'اہل حق' کو دین سیاست کی حکمت سمجھا"۔

مولانائے روم نے دفتر اول میں نالۂ نے کے بعد شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کو یاد کیا ہے اقبال شمس فلک سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

خطاب بہ مہر عالمتاب | اے امیر خاور تیری روشنی اور گرمی سے کائنات کی ہر شے کو فیض پہنچ رہا ہے، میرے دل کو بھی روشن کر دے تاکہ میں "احرار شرق" کے سینہ کو چمکا دوں اور ان کے افکار کو بند فرنگ سے آزاد کر دوں، اس لئے کہ جب کسی قوم کے خیالات خراب ہو جاتے ہیں تو ان کی کھری چاندی بھی کھوٹی ہو جاتی ہے، کجی راستی اور راستی کجی نظر آتی ہے، اور قلب سلیم پر موت کی غشی چھا جاتی ہے۔ ایسی حالت میں سب سے پہلے "تطہیر فکر" چاہیئے، پھر تعمیر خودی آسان ہے۔

حکمت کلیمی و حکمت فرعونی | اس تمہید کے بعد حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی کا موازنہ شروع ہوتا ہے حکمت کلیمی انسان کو درس لاخوف علیہم دے کر قلب میں عزم و تسلیم و رضا کے چراغ روشن کر دیتی ہے، جس کی روشنی

میں، وہ اپنی مراد کے موافق جہان کو نئے طریقے پر تعمیر کرتا ہے۔ برعکس اس کے حکمت فرعونی "مکروفن" کا جال بچھاتی ہے، اس کی درسگاہ میں کج حضوری کی تعلیم ہوتی ہے۔ شیخِ ملت دین کو توڑ مروڑ کر آقاؤں کے حسب دلخواہ پیش کرتا ہے جو بوڑھے ہیں وہ حیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، جو جوان ہیں ان میں نسائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فیشن کے دیوانے اور دل مردہ۔ اور لڑکیوں کا کیا پوچھنا وہ بڑی بیباک، زبان قینچی کی طرح چلتی ہوئی، بنی ٹھنی اپنی چھب دکھاتی پھرتی ہیں ملت میں جب ایسے ارکان ہوں تو "ان کی صبح شام سے بھی زیادہ تاریک ہے" ان کی کوشش ہے تو بس پیٹ بھرنے کے لئے اور خوف ہے تو بس موت کا۔ جو مالدار ہیں وہ عیش پسند اور کنجوس چھلکا دیکھتے ہیں، مغز کی خبر نہیں۔ حاکمانِ مجازی ان کے معبود ہیں، ایمان جائے مگر ان کی خوشنودی حاصل رہے۔ افسوس حرم کی اینٹ سے دیر کی تعمیر ہوئی۔ آہ قوم نے حق سے منہ موڑ لیا، وہ مرمٹی مگر اب تک نہ سمجھی!

لا الٰہ الا اللہ | یہ دلخراش منظر دکھا کر اقبال کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی سرخی کے تحت میں لا اور الا کا مفہوم فلسفہ اور تاریخ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

لا سے امتوں کا جلال ظاہر ہوتا ہے اور الا سے ان کا جمال نظر آتا ہے۔ لا اور الا کائنات کے فتحیاب ہیں۔ لا سے حرکت پیدا ہوتی ہے، الا سے سکون۔ لا مردِ خدا کی پہلی منزل ہے، یہ بجلی کی کڑک ہے، بانسری کی آواز نہیں ہے۔ اس کی ضرب سے لات و منات ریزہ ریزہ ہو گئے، قیصر و کسریٰ ہلاک ہو گئے، ایک نیا جہان پیدا ہوا اور غیر اللہ کا نقش مٹ گیا۔ یہ اسی لا کی صبح خیزی تھی کہ اب بے دھڑک اذان دی جاتی ہے اور اسی لا کی

تخم ریزی ہے کہ اسلام کا کھیت لہلہا رہا ہے۔ یہ لالہ کی شمع جو روشن ہے اُسی لا کی ندی کے کنارے سے لائے ہیں۔ خیر یہ تو عرب کا اعجاز تھا، ابھی کل کی بات ہے کہ دورِ فرنگ میں جو انقلاب روس میں ہوا ہے وہ اسی لا کا کرشمہ ہے "لا سلاطین لا کلیسا لا اللہ"۔

مگر روسی لا کی آندھی سے اپنے گھوڑے کو الا کی طرف ابھی تک نہیں لے جا سکے۔ کیا عجب کہ ایک دن وہی "جنوں" زور کرے اور وہ اس آندھی سے بچ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لَا اور اِلَّا دونوں امتوں کا ساز و برگ ہیں، اگر نفی کے ساتھ اثبات نہ ہو تو ان کو موت آجاتی ہے۔

فقر | فقر کیا ہے؟ "یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل" فقیر جو کی روٹی کھاتا ہے مگر درِ خیبر اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ فقر نام ہے ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا، اور یہ وہ مال ہے جو ہمارے پیغمبر برحق حضرت محمد مصطفیٰ کی امانت ہے۔ فقیر کو بادشاہوں کی پرواہ نہیں، اس کی چٹائی کے سامنے سلاطین کے تخت لرزتے ہیں۔ اس کے قلب میں جذب و سلوک کی وہ قوت ہوتی ہے کہ سلاطین کے سامنے بے تامل لا ملوک کا نعرہ مار کر استبداد کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔ قرآن میں جس فقر کی تعریف ہے وہ وہ ہے جو بندے میں مولا کے صفات پیدا کرے، نہ کہ حال و قال کی محفلوں میں اچھل کود۔ فقر وہ رہبانیت نہیں ہے جو خودی کو سوختہ کردے بلکہ وہ سوز و ساز ہے جو چراغ کی طرح روشن ہو۔ چاند اور سورج جو عریانی کی حالت میں چمک اٹھتے ہیں "فقر عریاں" کے نور کے سامنے لرز جاتے ہیں۔ یہ فقر عریاں وہ ہے جس کی بے سروسامانی نے بدر و حنین میں شان جلالی دکھائی اور ہاں یہ فقر عریاں وہ ہے جس کی بیکسی نے تشنہ لب حسینؓ کے نعرۂ تکبیر کی بجلی بن کر

فسق وملوکیت کے خرمن کو جلا دیا مگر آہ جب ہمارے فقر میں وہ ذوق عریانی نہ رہا، تو وہ جلال بھی رخصت ہو گیا۔ اب ہم مفلس قلاش اور بے پردا ہیں، نہ مال ہے کہ کوئی جابر چھین لے، نہ دل میں نور ہی ہے کہ شیطان ہی لے جائے۔ ہمارے "شیخ جی" لاٹ صاحب کے مرید بن گئے مگر بایزید بسطامی کے مقام کی شرح خوب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اب دین کی رونق محکومی میں ہے اور زندگی خودی کو مٹا دینا ہے۔ نذر و نیاز میں جو کچھ حضرت کو ملا، خوب کھایا اور اڑایا۔ گرجا کے گرد ناچے کودے اور آخر ٹھنڈے ہو گئے اور "ہارٹ فیل" ہو گیا۔

یہ ہمارا زمانہ ہے جس نے ہم سے وہ ذوق و شوق اور وہ سوز و درد چھین لیا اور جمال مصطفوی سے محروم کر دیا۔ اب ہمارے دل میں کوئی زندہ آرزو نہیں رہی۔ خدارا ذرا تو غیر سے بیگانہ بنو، کیوں یوں ڈرے اور سہمے جاتے ہو، تم تو بہت سے نغمے گا سکتے ہو، پھر کوؤں کے ساتھ کیوں اڑ رہے ہو، تلوار کی طرح تیز جاؤ، پھر قدرت کا تماشا دیکھو، تم میں وہ بے پناہ سیل پوشیدہ ہے جو پہاڑ کو تنکے کی طرح بہائے جا سکتی ہے، مگر خیال رہے کہ سیل اسی وقت تک سیل ہے جب تک اس میں روانی ہے، جہاں ٹھہری پھر کچھ نہ تھی۔ یہ کہتے کہتے اقبال کا رنگ یکایک بدلتا ہے اور ایک عجیب مؤثر پیرایہ میں کہتے ہیں "نہ میں ملا ہوں نہ فقیہ اور نہ فقر و درویشی سے واقف۔ دین کی راہ میں تیز ہیں تو ہوں مگر قدم سست پڑتے ہیں۔ ہاں ایک بات ہے کہ دل میں تڑپ ہے اس لئے میری اس تڑپ سے جو کچھ فائدہ اٹھانا ہو اٹھا لو میرے بعد مجھ ایسا مرد فقیر نہ آئے گا۔"

ازتب و تابم نصیب خود بگیر　　بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

مردِ حُر | فقر کی اچھوتی تشریح اور مؤثر تحریص کے بعد اب مردِ حر کی پہچان سمجھائی جاتی ہے۔ مردِ حُر وہ ہے کہ جب ہم میدان میں سوچتے ہوتے ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں، وہ سربکف بڑھتا ہے اور سلطان و میر کسی کا بندہ نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے جبار اس فقیر عریاں سے ڈرتے ہیں۔ ہم کو دین کے بھید کی خبر ہوتی ہے مگر اس کو نظر آتی ہے۔ ہم کلیسا کی درستی میں اپنی مسجدیں بیچ ڈالتے ہیں، مگر وہ ساقی کوثر کے مقدس ہاتھوں سے پی کر مست الست ہو جاتا ہے۔ ہم کبھی کلیسا کبھی دیر کو حاجت برآری کے لئے اپنا قبلہ بنا لیتے ہیں، مگر وہ غیر اللہ سے کبھی اپنا رزق نہیں مانگتے۔ ہم تو چنیں اور چناں میں رہ جاتے ہیں، مگر وہ کہتا کم ہے اور کرتا بہت ہے۔ پس علم کتابی کے مقابلہ میں ایسے مردِ حر کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے کیونکہ جب تک ایسے بزرگ کا دامن نہ پکڑا جائے گا، دنیا میں ایک تنکے کے برابر وقعت نہ ہوگی۔

اسرارِ شریعت | مولانائے رومؒ نے خوب کہا ہے ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول　　نعم مالٌ صالحٌ گفتہ رسولؐ

مال اگر خدمت دین کے لئے جمع کیا تو بہت اچھا ہے، ورنہ وبال ہے۔ اسی طرح انسان کو اکل حلال کی تلاش چاہیئے، لیکن افسوس یورپ اکل حلال کی اہمیت سمجھتا ہی نہیں اور حرام و حلال کے فرق کو فضول خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دانائی یہ ہے کہ کمزوروں سے روٹی چھین لی جائے، بلکہ ان کی جان تک نکال لی جائے۔ اب سوداگری آدم دری ہو گئی ہے اور یہودی قساوت دنیا کو تباہ کر رہی ہے۔ اب جب

تک یہ نظام تہ و بالا نہ ہوگا، تہذیب، عقل اور دین سب سودائے خام ہیں۔ اس جہانِ خیر و شر میں انسان نفع و ضرر میں مشکل سے تمیز کرتا ہے۔ حرام و حلال کا فرق فقیہانہ موشگافیوں سے معلوم نہیں ہوتا مگر اس یقین سے کہ احکام خداوندی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھائے ہیں، برحق ہیں، اپنے ضمیر کی گہرائیوں پر نظر ڈال! اسرار شریعت ظاہر ہونا شروع ہوں گے۔ مگر تاویل سے بچنا اس لئے کہ وہ ضمیر کو افسردہ کر دیتی ہے۔ میں نے صوفیوں کو بھی دیکھا اور شیخ مکتب کو بھی اور میرے زمانے میں ایک "پیغمبر صاحب" نکل پڑے ہیں۔ ان سب کے دعوے تو بڑے بڑے ہیں مگر ہے ہوسناکی۔ ع

منبر شاں منبر کاک است و بس

ان کا منبر وعظ نان بائی کی میز ہے جس پر وہ کیک اور روٹی رکھ کر بیچتا ہے۔ کہیں ایسے لوگ قوم و ملت کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟

اشکے چند بر افتراق ہندیان | اقبال پر جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے ملیت کے جوش میں وطنیت سے منہ موڑ لیا، وہ اس عنوان کے اشعار ذیل کو جو مرحوم کے آخر عمر کے اشک خونی ہیں غور سے پڑھیں، پھر خود ہی انصاف کریں ؎

اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر
خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر

زندگانی بر مراد دیگراں
جاوداں مرگ است نے خواب گراں

ہندیاں با یکدگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

تا فرنگی قومے از مغرب زمین ثالث آمد در نزاع کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب انقلاب اے انقلاب اے انقلاب!

اے ہمالہ تو دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ ہے اور اے اٹک اور گنگا تم کس فیاضی سے دودھ کی نہریں بہا رہی ہو ہم کب تک اس طور سے جئیں کہ نہ کچھ ہماری آبرو ہے اور نہ چہروں پر رونق آہ! ہم پست ہیں زار و نزار۔ ہمارے پیر مرد یہ سمجھتے ہی نہیں کہ زمانہ کیسی چالیں چل گیا، اور ہمارے نوجوانوں کی یہ حالت ہے کہ محبت کی گرمی ہی نہیں لال لہو سفید ہو گیا، پورب پچھم جدھر آنکھ اٹھاتے ہیں آزاد قومیں نظر آتی ہیں مگر ہم ہیں کہ غیر جانوروں کی طرح ہمارا شکار کھیل رہے ہیں۔ ہم مر مر کر اینٹیں پکاتے ہیں اور غیر اسی سے سونے کے محل کھڑے کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کا کھلونا غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک چاہیں کھیلیں، جب چاہیں توڑ ڈالیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم گہری نیند میں ہیں، ہم تو مر چکے۔ آہ! اہادر ہند کے فرزند آپس ہی میں لڑ لڑ کر تباہ ہو رہے ہیں۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ دونوں فریق کے لیڈر اور مذہبی پیشوا باہمی فیصلہ نہیں ہونے دیتے اور غیر قوم کے حاکم مغربی ہمارے مذہبی جھگڑوں میں بیچ بچاؤ کرانے آتے ہیں۔ پیاسے تو سب ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آب ہے یا سراب۔ ہم ترقی کے زینہ پر چڑھ رہے ہیں یا تنزل کے گڑھے میں گر رہے ہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب عظیم ہونے والا ہے

سیاسیات حاضرہ ہماری حالت اس چڑیا کی طرح ہے جو پنجرے میں بند ہو اور اس سے کہا جائے کہ تو اپنا گھونسلہ چڑیمار کے گھر میں بنائے۔ اسی میں تیری خیر ہے اس لئے کہ جو چڑیاں باغ میں گھونسلہ بناتی ہیں اُن

کو شکاری جانور کھا جاتے ہیں۔ بیچاری چڑیا اس افسوس سے دانہ پانی پاکر چہچہاتی ہے مگر ہے پنجرے میں۔ خدا کی پناہ نہیں کس کس ترکیبوں سے غلام بنایا ہے۔ ہمارے یہاں جمہوریت کا راگ گایا جاتا ہے جس کے پردے میں ملوکیت اپنا کام کرتی ہے، ہماری آنکھوں میں جو سرمہ لگایا جاتا ہے اس سے بینائی میں فتور پیدا ہوتا ہے اور ہماری مجبوری ہم کو اور بھی مجبور بنا دیتی ہے۔ اے اہل وطن ہوشیار رہنا کہیں ان کا پیالہ پی کر مست نہ ہو جانا اور کہیں ان کے ساتھ جوا کھیل کر ہار نہ جانا۔ مردِ حُر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا، وہ موسیٰؑ کی طرح فرعون کے سامنے کلام کرتا ہے اور اپنے عصا کی ضرب سے دریا کو چیر دیتا ہے۔ مگر آہ! اے قوم، تو نے غیر اللہ سے دل لگایا۔ ملت کے سینے میں خودی کو موت آگئی۔ پہاڑ تنکا بن گیا اور ہوا اڑا کرلے گئی۔ اس زار نالی کے بعد اقبال کو اپنی حالت یاد آتی ہے کہ وہ بھی تو غلام قوم کا ایک فرد ہے۔ اس تکلیف و احساس سے بیتاب ہو کر وہ اپنی اندرونی حالت پُردرد طریقہ سے یوں ظاہر کرتے ہیں۔

"عقلمند اپنے دل کا حال کسی سے کہتے نہیں مگر میں اپنا دردِ دل تجھ سے کیسے چھپاؤں۔ غلامی میں پیدا ہوا۔ کعبہ کے آستانہ سے دور پڑ گیا، درود پڑھتا ہوں تو پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں، اس لئے کہ عشق کہتا ہے" تو غیر کا محکوم ہے، تیرا سینہ تو بتکدہ ہے تو اس مقدس بزرگ کا نام لیتا ہے جس کا اٹھنا بیٹھنا، جینا مرنا سب خدا کے لئے تھا۔ جب تک تجھ میں رنگ و بوئے محمد صلعم نہ ہو، اس نام پاک کو اپنے درود سے آلودہ نہ کر۔ میں کیا کہوں، جب نماز کو کھڑا ہوتا ہوں تو حضورِ قلب نہیں پاتا۔ جب سجدہ کرتا ہوں سرورِ جاں نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو آزاد ہیں انھیں کو جلوۂ حق

نظر آتا ہے۔ مگر ہم غلام ہیں، اس کے جلال و جمال کو کیا جانیں۔ اگر سوزِ حیات بدن میں ہے تو نماز معراجِ مومنین ہے ورنہ محض اٹھنا بیٹھنا۔ آزاد قومیں جب عید مناتی ہیں تو ان کے ملک کی شان و شوکت اور دین کی عزت و عظمت ظاہر ہوتی ہے لیکن محکوم قوموں کی عید مسلمانوں کا ایک جمِ غفیر ہے اور کچھ بھی نہیں۔

حرفِ چند با اُمتِ عربیہ

اے وہ سرزمین! جو ابد تک یاد رہیگی، تجھے یاد ہے "لا قیصر و کسریٰ" کا نعرہ مار کر کس نے ملوکیت کا خاتمہ کیا تھا؟ کس نے سب سے پہلے دنیا کو قرآن سنایا اور الا اللہ کا چراغ روشن کیا؟ علم و حکمت کس کی خوانِ نعمت کے ریزے ہیں اور درس اخوت کس نے دیا؟ یہ اس نبیؐ امی کا طفیل ہے جس نے صحرائے عرب کو لالہ زار بنا دیا، حریت کو پروان چڑھایا، اور خاک کے پتلے کو ایک دل زندہ عطا کیا۔ بدر و حنین کے روحانی فتوحات اسی کے دم سے تھے اور زورِ حیدریؓ سوزِ صدیقیؓ، عدلِ فاروقیؓ اور رضائے حسینیؓ اسی کے خلقِ عظیم تھے۔ میدانِ جنگ میں اسی نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور مجاہدین کی صفوں کو صفِ نماز بنا دیا۔ سلطان صلاح الدین کی تیغ جہاں کشا اور حضرت بایزید بسطامیؒ کی نگاہ حق بیں، رومؔ و رےؔ کے ذکر و فکر، الحمرا اور روضہ تاج گنج کی صناعیوں کا حسن عالم سوز، یہ سب اسی کے جلوے ہیں۔ اللہم صلی علیٰ محمدؐ و علیٰ آل محمدؐ۔

پس اے خاک عرب کے بسنے والو! تم نے اس زمانہ میں کیا کیا کہ رسول اللہ صلعم کی روح پاک کو تکلیف پہنچائی اور غیروں سے مل کر اپنوں کو تباہ کر دیا! ہاں یہ فرنگ کا افسوں تھا! اب اگر ان کے فریب

سے امان چاہتے ہو تو اپنے حوض سے اُن کے اونٹ بھگا دو اس لئے کہ انھوں نے بڑی چالاکی سے تمہاری وحدت قومی کو پارہ پارہ کر دیا اور تم کو اپنی حمایت میں لے کر بے حمیت بنا دیا۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

احوال جب اس قدر زار و زبوں ہو تو اقوام شرق کو کیا کرنا چاہیئے؟ سب سے پہلے یہ خیال پختہ ہو کہ اب مشرق کی رات ختم ہوئی، سورج نکلنے کو ہے، پھر یورپ کی موجودہ حالت پر غور کیا جائے۔

یورپ نے جو لادینی کا طریقہ (یعنی امور سلطنت میں دین سے بے تعلق رہنا) اختیار کیا وہ اصل میں ایک تلوار ہے، جس کی ضرب سے وہ خود زخمی ہو کر تڑپ رہا ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان جسم و جسمانیت ہے، جس میں روحانیت کا پتہ نہیں، اس لئے اس کا دل پتھر ہو گیا اور آنکھ میں آنسو نہ رہا۔ جبرئیل بھی اس کی صحبت میں ابلیس بن گیا اور اب اس کا علم و ہنر کندھے پر تلوار رکھے ہوئے نوع انسان کی ہلاکت میں مصروف ہے۔ بیشک جب تک عقل دل کے تابع ہے، یزدانی رہتی ہے، لیکن جہاں دل کی اطاعت سے آزاد ہوئی، شیطان بن گئی۔ ملک حبشہ کا حادثہ کس قدر عبرت انگیز ہے، یورپ نے بے تامل بھیڑیوں کو چھوڑ دیا کہ بیچارے میمنے کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔ اور جینوا کی لیگ اقوام میں کیا ہو رہا ہے؟ وہی مکر و فن۔ "وہی کفن چور ہیں جو کہتے ہیں کہ اس بیل کو تو مارے ہیں اس نیل گاؤ کو ابھی گرائے دیتا ہوں۔" الٰہی تو بہ! یہ کیا آشوب عالم ہے!

اے اہل شرق! تم نے یورپ کا رنگ دیکھ لیا، اب اس رنگ

سے پاک ہو جاؤ۔ مشرق کی آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔ جو قدیم تہذیب کے نام لیوا بکھرے ہوئے ہیں ان کی شیرازہ بندی کرو اور صدق وصفا کا جھنڈا اونچا کرو۔ اہل حق کی زندگی قوت سے ہے اور ہر ملت کی قوت جمعیت سے ہے۔

اے سرزمین ایشیا! اے خاک خاور! اے تہذیب اور دین کی دولتوں کی امین! اٹھ اور اپنی اقوام کی گتھیوں کو خود ہی سلجھا، یورپ کے نشہ کو اتار دے اور دیو سفید کے پنجہ سے آزاد ہو جا! تو نے اس کی کارستانیاں خوب دیکھ لیں، سلطنت اب سوداگری بن گئی، ایسے سوداگروں کی زبان تو میٹھی ہوتی ہے، مگر دل بس کی گانٹھ۔ ان کی ریشمی پوشاک سے اپنی گدڑی بہتر ہے۔ کڑاکے کے جاڑے کسی نہ کسی طرح بسر کر دے مگر ان کی پوستین مت خریدنا۔ ان کی ترکیبیں عجیب ہیں، بغیر لڑائی کے مار ڈالتے ہیں اور ان کی مشینوں میں موت چکر کھاتی ہے۔ اپنی چٹائی پر بیٹھ، اوروں کی قالین نہ لے اور یہ جو مشک وہ بیچ رہے ہیں وہ کتے کی ناف سے نکلا ہے، نافۂ آہو نہیں ہے۔ ان کے نرم نرم مخملی گدے رہزن ہوش ہیں۔ دیکھ تیری پگڑی ان کے کپڑے سے نہ بنے نہیں تو وہ اچھال دیں گے۔ جو ہوشمند ہیں وہ ان کی شراب منہ سے نہیں لگاتے اور جنھوں نے ایک گھونٹ پیا بس وہیں ختم ہو گئے۔

پس اے اہل شرق! اپنی ہی سرزمین کی چیزیں کھاؤ، پیو اور بیچو۔ دیکھو تم میں جو عقلمند ہیں وہ اپنی کملی آپ ہی بن رہے ہیں۔ یورپ والے غضب کے پتلے اور بلا کے چلتے پرزے ہیں۔ ریشم تم سے لیتے ہیں پھر مال بنا کر تمہارے گلے منڈھتے ہیں۔ حیف صد حیف! دریا اپنے ہی موتی

غوطہ خور سے خرید رہا ہے!

در حضورِ رسالت مآب | خاتمہ میں اقبال اپنا دردِ دل اور ملت کا حالِ زار رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور میں عرض کرتے ہیں اور حصولِ آزادی کی دعا کرتے ہیں۔

اقبالؔ کا جذبۂ مذہبیّت

مولینا سعید احمد صاحب اکبرآبادی

کسی حکیم کا مقولہ ہے، تاریخ کو جب کسی انسان کی ضرورت ہوتی ہے تو اُسے وہ خود بخود پیدا کرلیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب برطانوی ملوکیت کے قدم ہندوستان کی سرزمین خجستہ آئین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو اس انقلابِ عظیم کا سب سے گہرا اور عمیق اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑا۔ دلی کا تخت ان کے قبضہ سے کیا نکلا کہ ہندوستان کے زمین و آسمان بھی سرتاسر بدل گئے اور مسلمانان ہند ہر چیز میں انقلاب کا شدید اثر محسوس کرنے لگے۔ اس انقلاب میں سب سے زیادہ المناک حقیقت مسلمانوں کا ذہنی و دماغی زوال تھا جو انگریزوں کے استبداد اور مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نتیجہ تھا۔ مذہبی طبقہ کا یہ حال تھا کہ جمود و خمود کی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کو اپنی مسجدوں اور خانقاہوں سے باہر کسی اور چیز کی خبر ہی نہ تھی۔ جو لوگ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے ان کو مذہب سے نہ صرف بُعد بلکہ ایک گونہ نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ فرنگی تہذیب و تمدن، فرنگی معاشرت اور فرنگی طریق بود و باش اُن کے نزدیک وسیلہ ترقی اور ذریعۂ عروج تھا۔ اسلامیت اور اسلامی قومیت کا تصور بھی ان کے احساس ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔

اسی دور میں مولانا حالی پیدا ہوئے اور اپنی قوم کی زبوں حالی دیکھ کر اُنھوں نے اس انداز میں مرثیہ خوانی شروع کی کہ تمام ارباب محفل کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو رواں ہو گئے اور سب پھوٹ پھوٹ کر گریہ و زاری کرنے لگے۔ لیکن مولانا حالی کی مثال اس ناصح مشفق کی سی تھی جو کسی بیمار کو گرفتار مرض دیکھ کر اس کی بے احتیاطیوں اور بے عنوانیوں پر ملامت کرنے لگے۔ انھوں نے مسلمانوں کی قوم سوختہ نصیب سے اس کا ایک ایک مرض تو بیان کیا اور وہ مرض جن بے ائمہ الیوں سے پیدا ہوا تھا ان کی تشریح میں طاقت لسانی سے پورا پورا کام بھی لیا لیکن اس فساد کا جو اصل سرچشمہ تھا، اس سے اپنا پہلو بچا کر نکل گئے۔ اور کچھ مصلحت وقت، کچھ دور اندیشی اور کچھ سیاسی پامالی کی مرعوبیت کے باعث یہ نہ بتا سکے کہ مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خواجہ حالی نے اس مرغ ناتواں کو تو جی بھر کے کوسا جو اپنی سادہ طبعی کے باعث کسی کے دام رنگیں میں جا پھنسا اور اسیر تہِ دام ہو کر اپنے بال و پر کی تمام طاقت اور پرواز کی تمام صلاحیتیں گم کر بیٹھا۔ لیکن انھوں نے اس صیادِ فریب کار سے کچھ نہ کہا جس نے اس مرغ زریں پر کے لئے ایک ہم رنگ زمین دام بچھایا تھا، اور جس نے اک طائر فلک پرواز کو قید و بند میں ڈال کر بے برگ و نوا کر چھوڑا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے زخم مندمل ہونے کے بجائے اور پھوٹ کر بہ پڑے۔ جس سے ان کا لباس قومیت آلودہ ہوئے بغیر نہ رہا۔ حالی سر سید کی جماعت کے ایک رکن تھے اور سر سید کا نظریہ یہ تھا کہ کوئی محکوم قوم حکمراں قوم سے نفرت رکھ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ وہ

"زمانہ باتونسازد تو بازمانہ بساز" کے اصول پر خود عمل پیرا تھے اور اسی اصول پر اپنی پوری قوم کو چلانا چاہتے تھے۔ حالی کی سرگرمیاں اور اُن کی نوا پیرائیاں بھی زیادہ تر اسی مقصد کے لئے وقف تھیں۔ حالی سرسید کی زبان تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے سرسید اس کا ایک عملی خاکہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے، لیکن تجرباتِ مابعد نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ سرسید نے مسلمانوں کے لئے جو نسخۂ شفا تجویز کیا تھا اس سے عارضی طور پر مریض کو ایک گونہ سکون تو ضرور حاصل ہو جاتا تھا اور اس کے پینے سے بیمار کے مرجھائے چہرہ میں تھوڑی بہت آب و تاب بھی پیدا ہو جاتی تھی، لیکن دراصل وہ اصل مرض کا علاج نہ تھا۔ مریض کی ظاہری حالت اگرچہ روبہ اصلاح نظر آنے لگی مگر اصل بیماری اندر ہی اندر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ اس نے مریض کے تمام اعضائے رئیسہ کو کمزور اور اس کی روح کو مضمحل کر کے رکھ دیا۔

اس ہنگامۂ رستخیز میں ضرورت تھی کہ ایک ایسا حکیم لائق اور طبیب حاذق پیدا ہو جو اصل مرض کی تشخیص کر کے ایک کامیاب نسخۂ شفا لکھے اور ایک ایسی داروئے صحت تجویز کرے جس کے استعمال سے دماغ میں طاقت، ذہن میں بیداری، اعصاب میں چستی اور ہوش و حواس میں آمادگی کار اور روح میں لطافت و قوت پیدا ہو جائے۔ مسلمانانِ ہند کی واماندہ قوم ایسے طبیب عیسیٰ نفس کے انتظار میں ایک ایک ساعت کرب و اضطراب کا شمار کر رہی تھی کہ اقبالِ جادو بیاں نے اپنا ترانہ چھیڑا اور ملتِ اسلامیۂ ہند کے اجڑے ہوئے چمن کی اس عندلیب نغمہ سرا نے کچھ اس انداز سے زمزمہ سنجی شروع کی کہ اس

خزاں رسیدہ چمن کی ایک ایک کلی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ مرجھائے ہوئے پتوں میں سرسبزی و شادابی پیدا ہونے لگی اور چمن کا گوشہ گوشہ عروس بہار کی حنا بندی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

حکیم اسلام، فیلسوف مشرق، ڈاکٹر اقبال نے جگہ جگہ اس غلطی پر متنبہ کیا ہے کہ صرف تعلیم جدید کا حاصل کرنا ہماری مشکلات کا کامیاب حل نہیں ہے۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ اگر تعلیم کے ساتھ صحیح مذہبی تربیت کا خیال نہ رکھا گیا تو ایسی تعلیم ہمارے امراض کو دور کرنے کے عوض ان میں چند در چند اضافہ کا باعث ہوگی۔ موصوف کو یقین ہے کہ تعلیم سے قبل اور اس سے زیادہ ضروری پختہ ایمان، ذوق عمل، قومیت اور اپنی خودی یا انفرادیت کا مکمل اور قوی احساس ہے۔ اقبال کا نظریہ ہے کہ محض تعلیم اقوام مغرب کے لئے مفید ہو تو ہو، امت مسلمہ کے لئے کسی طرح مفید اور کارگر نہیں ہو سکتی۔ مذہب کے عنوان سے ایک قطعہ ہے، اس میں فرماتے ہیں

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

علوم جدیدہ کی تحصیل اگر مذہب کے بغیر اور اس کی نگرانی میں نہ ہو تو وہ ہدایت اور ترقی نہیں، گمراہی اور ضلالت ہے۔ اپنے اس خیال کو کس لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تلاش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی — اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام — ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور — مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
"با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست — ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

"مسلمان اور تعلیم جدید" پر اقبال نے ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں سرسیّد کے مشن پر کس بلیغ پیرایہ میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر — لازم ہے رہرو کے لئے دنیا میں سامانِ سفر
بدلی زمانہ کی ہوا، ایسا تغیر آگیا — تھے جو گراں قیمت کبھی اب ہیں متاعِ کس مخر
وہ شعلۂ روشن ترا ظلمت گریزاں جس سے تھی — گھٹ کر ہوا مثلِ شرر تارے بھی گم نور تر؟
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانۂ موجود ہو — غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر
ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تری — فرسودہ ہے پھندا ترا، زیرک ہے مرغِ تیز پر
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا — ہے خونِ فاسد کیلئے تعلیم مثلِ نیشتر

یہاں تک تو مرشد کی تقریر تھی جس نے "تعلیم جدید" کی برکات پر خوب وعظ کہا، اب اس پر اقبال مرحوم کہتے ہیں۔

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے — واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمانِ خضر

فرمان خضر کی تعلیم کا نتیجہ کیا ہوا؟ فرماتے ہیں ؎

لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری — "رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد"

ایک اور جگہ تعلیم اور اس کے نتائج کے زیر عنوان ارشاد ہوتا ہے ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما　　　لیکر آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
"تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو　　　کانچہ کشتیم زخجلت نتواں کرد درو"

اقبال نے جگہ جگہ فرنگ کی مادہ پرستی اور تہذیب جدید کی ہولناکیوں کا ذکر نہایت درد انگیز اور عبرت خیز پیرایہ میں کیا ہے اور اس راز کی عقدہ کشائی کی ہے کہ اقوام مشرق پر جمود و خمود کی نیند کیوں طاری ہے اور اس کے بالمقابل مغرب کے بازاروں میں اگرچہ فلسفۂ سائینس کی گرمی اور عقلی و مادی ترقی کی بڑی چہل پہل نظر آتی ہے، لیکن اُن میں "روحانیت" کے اُس عنصر لطیف کا فقدان ہے جو زندگی کا اصل جوہر اور بقار حیات کی واقعی تفسیر ہے۔ روح اگر مردہ ہے تو جسم کتنا ہی فربہ ہو، بیکار محض ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جو ہمارے مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے بالکل اجنبی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

ایک موقع پر مشرق و مغرب کی موجودہ حالت اور فلسفہ ترقی و تنزل کا نقشہ کس حکیمانہ انداز میں کھینچتے ہیں ؎

مردہ بیدینی افکار سے افرنگ میں عشق　　　عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

جو لوگ مغربی علوم کی سحر کاریوں سے متاثر ہو کر عروج و ترقی کے مفہوم کو تہذیب و تمدن کے ارتقار میں ہی محدود سمجھتے ہیں اور اخلاق کا تزکیہ نفس کا تصفیہ اور روحانیت کی سربلندی ان کی نظر میں چنداں وقعت نہیں رکھتی، اقبال اُن کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر ۔۔۔ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
آج مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی بربادی اور دنیوی انحطاط و پستی کا ماتم کرنے والے بہت ہیں لیکن روحانیت اور مذہب و اخلاق کے اعتبار سے وہ روز بروز جس قعر تنزل میں گرتے چلے جا رہے ہیں، اس پر توجہ کرنے والا کوئی نہیں۔ انگریزوں کے استیلاء سیاسی پر آنسو بہانے والے کم نہیں لیکن وہ کتنے ہیں جن کو درحقیقت مسلمانوں کی ذہنی و دماغی غلامی کا درد ہو۔ اقبال اسی پر اشک افشانی کرتے ہیں۔
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم ۔۔۔ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

پھر فرماتے ہیں ؎
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا ۔۔۔ کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

فرانس میں تہذیب جدید کی گرم بازاری دیکھ کر بے ساختہ دل بھر آیا اور شعر ذیل کی صورت میں آہِ دردمند نکل ہی گئی ؎
ڈھونڈھ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام ۔۔۔ وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام
لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مذہب سے ان کی مراد ظاہری اور رسمی طور پر عبادت کرنا نہیں ہے۔ وہ آجکل کے نام نہاد مسلمانوں سے بیزار ہیں اور ان میں پھر وہی "ولولۂ عمر"، "صداقتِ ابوبکر"، "فقر بوذر"، "راستی سلمان"، "جاں نثاری طلحہ"، "شجاعتِ خالد"، "پاکبازی عثمان" اور "ہمت و حوصلۂ علی" دیکھنا چاہتے ہیں جس نے چند برسوں میں دنیا کی تاریخ کو یک قلم پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اقبال "تقلید فرنگ" اور "چنگیزی افرنگ" سے حد درجہ نالاں ہیں۔ وہ عالم اخلاق و روحانیت کو اجڑتا ہوا دیکھتا ہے تو معمارِ حرم کو آواز دیتا ہے ۔ ع

معمارِ حرم باز بہ تعمیر حرم خیز

اس کو یقین ہے کہ مرض کی کامیاب دوا صرف "شفا خانہ حجاز" سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اُس کے لئے فرنگستان کے ہسپتالوں کی خاک چھاننا نہ صرف جہالت بلکہ حماقت ہے۔ اس بنا پر اقبالؔ کے نظریہ میں مسلمانوں کی ترقی کا راز صرف اسی میں ہے کہ وہ پکے مسلمان بن جائیں، اس میں نہیں کہ یورپ کی تقلید میں اندھے ہو کر اپنی خودی کو بھی فراموش کر بیٹھیں۔ جاوید سلمہ کو نصیحت کرتے ہیں۔

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر — مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

مگر ان نمائشی سجدوں اور ریاکارانہ نمازوں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ کس قسم کی نماز چاہتے ہیں، شعر ذیل سے واضح ہوگا ؎

سجدۂ تو بر آورد از دل کافراں خروش — اے کہ دراز تر کنی پیش کساں نماز را

اقبالؔ کہتے ہیں کہ پتھروں کے بت توڑنے سے کام نہیں چلتا جب تک کہ دل ماسوا اللہ کے خیال سے بالکل خالی نہ ہو جائے۔ محمود غزنوی پر کیا خوب تعریض کی ہے۔

تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را — بر ہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مذہب اور روحانیت کا عمل دخل اقبال کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے اور اس حقیقت کو انھوں نے بار بار مختلف پیرایۂ بیان سے موقع بموقع ظاہر کیا ہے۔ پھر مذاہب عالم میں سے وہ صرف اسلام کو حق سمجھتے ہیں اور نہ صرف یہی بلکہ دل و جان سے اس کے گرویدہ اور عاشق زار ہیں۔ وہ ہر اُس ترقی کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہیں جو مسلمان رہ کر کی جائے لیکن اگر یہ نہیں

ہے تو وہ ترقی، ترقی نہیں، فریب ہے، دھوکہ ہے اور ایک ملمع کیا ہوا نقش باطل ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر ہم اقبالؔ کو عہد جدید کا زبردست مفکر اسلامی، مجدد ملت اور اسلامی انقلاب کا سب سے بڑا داعی کہتے ہیں۔ اقبال نے (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کبھی محض ایک فلسفی یا مفکر ہونے کی حیثیت سے دنیا کی موجودہ مشکلات سیاسی و معاشی پر غور نہیں کیا، بلکہ وہ ہر چیز پر ایک زبردست اسلامی فلاسفر کی حیثیت سے نگاہ ڈالتے تھے۔ ان کا یہی جذبۂ مذہبیت تھا جس سے مجبور ہو کر وہ ہندوستان کے ایک نامور مجاہد اسلام اور محدّث و مفسر کو "چہ بے خبر ز مقام محمد عربیست" کا طعنہ دے بیٹھے تھے۔ آج مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں مذہبیت و قومیت کا جو احساس قومی پایا جا رہا ہے، ایک بڑی حد تک اسی شیدائے اسلام، شاعر فلک پایہ کی نوا سنجیوں کا رہین منت ہے جس نے خود کہا تھا ؎

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

آہ کہ اب اقبال ہم میں نہیں ہیں، اور ہم سے رخصت ہو کر وہیں پہنچ گئے ہیں جہاں ہر انسان کو پہنچنا ہے۔ اور اگر حدیث انا عند ظن عبدی بی صحیح ہے تو مجھ کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کا مقام وہی ہے جو صدیقین و شہدا کا ہے۔ اقبالؔ کا عالم نزع میں یہ کہنا کہ "میں مسلمان ہوں اس لئے موت سے نہیں ڈرتا" ان کی پختہ ایمانی کی محکم دلیل ہے، اور ہاں وہ بہادر اور بلند ہمت مسلمان موت سے کیوں ڈرنے لگا، جس نے ایک مرتبہ کہا تھا ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمّت مردانہ

اقبال نے وفات سے چند روز پہلے قاضی الحاجات کی بارگاہ میں دعا کی تھی ؎

توغنی از ہر دو عالم من فقیر   روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر   از نگاہ مصطفٰے پنہاں بگیر

یہ بھی ایک "بندۂ شرمسار" کا لطیف طریق عذر خواہی تھا، کیونکہ وہ یقین رکھتا تھا کہ "نگاہ مصطفٰے" اپنے عاشق جاں نثار سے اتنی غافل رہ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کا تمام حساب وکتاب ہوجائے اور شاہ کونین و رحمتہ للعالمین کو اُس کی خبر ہی نہ ہو۔ اَللّٰھم اغفرلہٗ واعطِ علیہ شآبیبَ رحمتکَ الواسعۃ۔ آمین ثم آمین۔

خضرِ راہ

محمد اسمٰعیل خاں صاحب متعلم بی۔اے

نظم خضرِ راہ تقریباً ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کی ہے، اور شکوہ جواب شکوہ، شمع و شاعر اور طلوعِ اسلام کی نظموں کی طرح علامہ اقبال نے اس کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں خود پڑھا تھا۔ نظم اثر و سوز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مرحوم جب یہ نظم پڑھ رہے تھے، رقت قلب سے آنکھیں آبدیدہ تھیں اور طبیعت کی بے حالی کا یہ عالم تھا کہ ایک شعر پڑھنے کے بعد رکتے اور جب طبیعت سنبھلتی تو دوسرا شعر پڑھتے۔ مجمع تمام تر مسلمانوں کا تھا اور ان کے دل جنگ عظیم اور اس کے بعد کے حادثوں کی مصیبتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ خضرِ راہ پڑھی جا رہی تھی اور ان کی یہ حالت تھی کہ روتے روتے گھگھی بندھ گئی تھی۔

جنگ عظیم کی خونیں داستان انسانیت کبھی نہیں بھلا سکتی۔ پورے چار برس تک کروڑوں انسانوں کا ایک دوسرے کو فنا کرنے میں لگے رہنا دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ایک جنون تھا جس نے نہ عقل رہنے دی اور نہ انسانی جذبات۔ لاکھوں لڑنے والے اس جنگ میں کام آئے، بے شمار عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے اور جو بچے وہ ان صدموں سے جیتے جی مر گئے۔ قتل و غارت نے ملک کے ملک تباہ

کر دئے، کھانے کمانے کے ذریعے بند ہو گئے۔ کوئی ایسا نہ بچا جس کا دل دکھی اور آنکھیں اشک بار نہ ہوئی ہوں۔

یورپ والے جان دار تھے، ان صدموں کو برداشت کر گئے، لیکن مسلمان جو برسوں سے زوال کی منزلیں طے کر رہے تھے اس صدمے سے نہ سنبھل سکے۔ ترک لڑائی ہار گئے، ان کا خلیفہ دشمنوں کے ہاتھ میں قید ہو گیا۔ پایۂ تخت خلافت کی سڑکوں اور گلیوں میں فرانسیسی اور برطانی سپاہی دندناتے نظر آئے، ان کا ملک فاتحوں نے آپس میں بانٹ لیا اور صاف ظاہر ہو گیا کہ ترک ختم ہو گئے۔ ایران ۱۹۰۸ء سے دم توڑ رہا تھا، جنگ عظیم نے اس کو بالکل بے جان کر دیا۔ عرب ترکوں سے آزادی پانے کے لئے دشمنوں سے مل گئے تھے لیکن ترکوں کے پنجے سے نکل کر فرانس اور برطانیہ کی چنگل میں پھنس گئے۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ دمشق و بغداد اجنبی ہاتھوں میں چلے گئے، مکہ اور مدینہ نام کے آزاد رہے، لیکن ان پر قبضہ دشمنوں کے وظیفہ خواروں کا تھا۔

جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ اس شورش کو دبانے کے لئے حکومت نے پنجاب والوں کو خوب ذلیل کیا اور جلیانوالہ باغ میں نہتے اور بے قصور لوگوں کا خون بے دریغ بہایا۔ اس پر بے چینی پھیلی تو ہزاروں ہندوستانی جیلوں میں بند کر دئے گئے، بیکسی اور بے بسی، قہر و جبروت کا کیا مقابلہ کرتی، قومی تحریک مرجھا کر رہ گئی۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی خلافت کے لئے اٹھے، بڑی قربانیاں کیں، ہنگامو ں سے ملک کو ہلا دیا۔ ترکی خلافت تو ایک طرف، ترکوں کا وجود مٹا جا رہا تھا، قسطنطنیہ پر تو برطانیہ اور فرانس کا قبضہ تھا ہی، یونان کو سمرنا دے دیا گیا

اور یونانی فوجیں شہر اور گاؤں جلاتی انگورہ کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی قومی تحریک کو ختم کر دیں۔

یاس و نامرادی اور رنج و کرب کی اس دنیا میں اقبال خضر راہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے انسانیت کو تباہ ہوتے، بستیوں کو اجڑتے، بادشاہوں کو بے تاج ہوتے، لاکھوں انسانوں کو مرتے، ملکوں اور قوموں کو مٹتے دیکھا۔ اس نے اپنی ملت کے آفتاب کو بھی افق مغرب میں غائب ہوتے پایا۔ انسانیت کے اس دردناک انجام اور اپنی محبوب قوم کے اس یاس انگیز حشر کو دیکھ کر اقبال کا دل غم و غصے سے تلملا اٹھتا ہے۔ وہ باور نہیں کرتا کہ انسانیت یوں مٹ سکتی ہے اور امت اسلامیہ اس طرح فنا ہو سکتی ہے، لیکن وہ اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاتا؟ حقائق سے انکار کیسے کرتا؟ اس کا دل نہیں مانتا، عقل کسی طرح اس حقیقت کو قبول نہیں کرتی۔ اقبال پریشان ہو جاتا ہے، دل و نظر کی کشمکش بڑھتی ہے۔ موت منہ کھولے نظر کے سامنے، اور دل ہے کہ اس سے انکار کرتا ہے۔ اس اضطراب میں شاعر کو سکون کہاں؟ وہ پریشان ہے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں۔ ساحل دریا پہ حضرت خضر سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس زندۂ جاوید بزرگ نے ہزارہا قوموں کو بنتے اور مٹتے، مٹتے اور بنتے دیکھا ہے، اس لئے ان سے بڑھ کر موت اور زندگی کے راز سے کون واقف ہو سکتا ہے؟

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

خضر کے اس سوال پر شاعر کے دل میں ہنگامۂ محشر بپا ہوتا ہے۔ وہ سکون کی جستجو میں تو تھا ہی، اس بزرگ سے اپنی داستانِ درد کہہ دیتا ہے۔

شاعر کو تعجب ہے کہ حضرت خضر کیوں موت و زندگی کے چکر سے بچے ہوئے ہیں، وہ ہمیشہ سے کیوں زندہ ہیں، موت ان کو کیوں نہیں چھوتی؟

حضرت خضر اس زندہ جاویدی کا سبب تگاپوئے دمادم یعنی سعی مسلسل بتاتے تھے۔ اس سعی مسلسل سے زندگی کی حقیقتیں انسان پر آشکارا ہوتی رہتی ہیں، طبیعت کی یہ جستجو اور دل کی یہ تڑپ نئی نئی دنیائیں ڈھونڈھتی ہے جس سے زندگی کا ولولہ تازہ رہتا ہے اور اس سے انسان کو دوام ملتا ہے اور وہ اجل کا شکار ہونے کی بجائے اس کو شکار کرتا ہے۔ یہی طلب و جستجو ہے کہ حضرت خضر کو بھی زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

مانا دوام زندگی کا راز گردش پیہم میں ہے لیکن یہ موت جو ہزاروں لاکھوں کو فنا کر رہی ہے جس نے جنگ عظیم کی شکل میں قوموں کو تباہ کر دیا، یہ زندگی کو کہاں دوام کی نعمت سے متمتع ہونے دیتی ہے؟

خضر فرماتے ہیں کہ زندگی کو ان پیمانوں سے نہ ناپ۔ زندگی دنیا میں محض زندہ رہنے کا نام نہیں، بہت سے اس عالم خاک و ہوا میں زندہ ہیں لیکن وہ حقیقت میں مردہ ہیں اور بہت سے مر کر زندگانی کا ثبات حاصل کرتے ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

زندگی کی اصل حقیقت ایک جوش و ولولہ ہے جو تجلی و نمود کے لئے بے قرار ہے۔ زندہ وہ ہے جو کُن کہے تو ایک نئی دنیا اس کے سامنے آموجود ہو اور اس کا ولولہ و شوق کوہکن کی طرح محال کو ممکن اور مشکل کو آسان کر دے۔ جب کوئی انسان اس جوہر زندگی کو پا لیتا ہے تو وہ سانس ختم ہونے سے مرتا نہیں، اس کی طلب و جستجو جسم کے مٹی کے انبار سے بے نیاز ہو کر عمل اور اقدام کی تلوار بن جاتی ہے۔

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے　　گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو　　پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

انسان میں یہ جوہر زندگی پیدا کیسے ہو، اور فنا کو بقا کیوں کر ملے؟ یہ چیز صداقت کے لئے عزم و یقین پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس عزم و یقین کے لئے جان دینا، زندگی کو دوام بخشتا ہے۔ اس آگ میں جل کر انسان نئے جہان کا سامان کرتا ہے اور اس کی چنگاری مشرق و مغرب کو روشن کر دیتی ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

انسانوں کا لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں مرنا زندگی کو فنا کا پیام نہیں۔ یہ فنا تو اصل زندگی کے لئے نئی دنیا بنا رہی ہے۔ تخریب سے ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ یہ تو تعمیر کا پیش خیمہ ہے، اس ہنگامۂ تعمیر میں شریک ہونا فرد کی زندگی کا ثبوت ہے۔

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے ۔۔۔ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

برسوں کی نیند کے بعد ہندوستانی بے اختیار دیوانہ وار اٹھے، غلاموں کے دل ولولۂ آزادی سے گرمائے، نہ جیلوں کا ڈر، نہ انگریزی قوت کا خوف، زندگی کی نمود کا جذبہ ہر شخص کو سرشار کرتا چلا گیا۔ بچے بوڑھے، نوجوان اور عورتیں تک میدان عمل میں نکل آئیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں ہنگامہ بپا ہو گیا، جوش عمل کا ایک سیلاب تھا جو سب کو بہاتا چلا گیا۔ جیلیں بھر گئیں، آزادی کے نعروں نے آسماں و زمین لرزا دیئے، لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ یہ ہنگامے ٹھنڈے ہو گئے آزادی کا جوش دھیما پڑ گیا۔ نئی اصلاحات نے اہل ملک کی توجہ اسمبلیوں کونسلوں اور وزارتوں کی طرف کر دی، نہ وہ جوش و خروش رہا اور نہ ولولۂ عمل، خضر اس انقلاب کا راز یوں کھولتے ہیں۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الملوک ۔۔۔ سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

بادشاہوں کی جادوگری محکوم کو غلامی کی نیند سے بیدار ہوتے دیکھ کر اپنے منتروں کے زور سے پھر گہری نیند سلا دیتی ہے۔ غلام کا احساس اس درجہ مر جاتا ہے کہ وہ غلامی کو آزادی سمجھنے لگتا ہے اور حکمراں کی میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس وقت کسی موسیٰ کی ضرورت ہوتی ہے جو حکمرانوں کے تمام ظاہری الطاف اور عنایات کے باوجود

غلامی کے بت کو توڑنے پر تل جائے، وہ خود اپنی دنیا بنائے خضر متنبہ کرتا ہے، اصلاحات کے نام سے ہندوستان کو جو کچھ دیا جا رہا ہے، وہ غلامی کی زنجیروں کو اور محکم کردے گا، مجلس آئین، اصلاحات اور رعایات و حقوق کے مزے تو میٹھے ہیں لیکن ان کا اثر بہت برا ہے، یہ بیدار قوم کو پھر سلا کر رہیں گے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اب سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

جنگ عظیم نے پرانی دنیا بالکل بدل دی، بادشاہ بے تاج ہو گئے، آزاد غلام اور غلام آزاد ہو گئے، مزدور جو صدیوں سے آوارہ و تباہ حال تھے، اب سروری کر رہے ہیں، زار روس کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ لینن فرماں روائی کر رہا ہے، جرمنی، اٹلی، فرانس اور انگلستان کی فضائیں مزدوروں کی صداؤں سے گونج رہی ہیں، بادشاہت خوار و خراب ہے۔ سرمایہ دار کا جاذبہ بے اثر ہو گیا۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اسکندر و جم کے قصے ختم ہو گئے، اب جمہور کی آزادی کا زمانہ آ رہا ہے، ایک نیا جہان زیر تعمیر ہے اور جنت کی تلاش میں انسان بہت تگ و دو کر رہا ہے، وہ اس دنیا میں جنت کو لے کر رہے گا۔

نغمۂ بیداری جمہور ہے سامان عیش — قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام — دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

خضر مزدور کو طواف غیر سے آزاد ہونے کی دعوت دیتا ہے اور خواجگی یعنی سرمایہ داری نے نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب اور رنگ کے جو بت بنائے تھے ان کو توڑ کر اپنی فطرت سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — "خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کر مکِ ناداں طواف شمع سے آزاد ہو — اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

شاعر کا دل دنیائے اسلام کی مصیبتوں سے غم ناک ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان تباہ و برباد ہو گئے ہیں، حجاز کی پاک خاک تک کلیسا کی دار و گیر سے نہیں بچی، "کلاہ لالہ رنگ" کو زمانہ نے ذلیل کر دیا ہے اور اس کے پہننے والے جو کل تک سربلند تھے آج خوار ہیں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں — مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز!
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

یہ سب کچھ ہوا لیکن اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مسلمان کا جسم تو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جا چکا تھا اس کی روح بھی فرنگ کے اثر سے مسخ ہو رہی ہے، مغرب کے مے خانوں سے وطن پرستی کی شراب مشرق میں پہنچی اور اس کے نشے میں مسلمان بدمست ہو رہا ہے، ایران ایرانیت کی ترنگ میں ہے عربوں نے عربیت کے جنون میں ترکوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کئے، ترک اس لعنت میں پھنس کر عالم اسلام سے غافل ہو گیا تھا۔ یورپ کی اس شراب نے ملت کے جسم کو پارہ پارہ کر دیا، وحدت نہ رہی تو ایک ایک کر کے دشمنوں کا نشانہ بنے اور اب حالت یہ ہے کہ:۔

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

وطن پرستی کی شراب کی تباہ کاریوں نے ملت کی یہ حالت کر دی ہے کہ۔

لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس — وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے میناگداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

خضر شاعر کو اطمینان دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ رومی کا ارشاد یاد کر کہ تعمیر کے لئے پہلے کی بنیاد کو کھودنا ہی پڑتا ہے۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند — می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

دنیائے اسلام پر بے شک تباہی آئی لیکن اس تباہی سے ملت کی آنکھیں کھل گئیں

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر

مغرب کے سیلاب نے اسلام کو بیدار کر دیا ہے۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مسلمانوں کو وطنیت کے محدود دائرے سے نکلنا چاہئے، رنگ و خون کا امتیاز نہ ترک کو باقی رکھے گا اور نہ عرب کو اور آپس کی لڑائی نے جس طرح پہلے دونوں کو تباہ کیا تھا اب پھر اسی تباہی سے نہ بچ سکیں گے

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو — ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

ایران اور ترکی کی جنگوں نے دونوں کو کمزور کر دیا اور آخر تیسرے دشمن نے دونوں کو اس حال تک بنا دیا۔ شیعہ اور سنی کے جھگڑے کب تک رہیں گے۔

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش — اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

خضر شاعر کو تسکین دیتا ہے کہ اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے مساوات انسانی و حریت آدم کا

جو خواب دکھایا تھا زمانہ اس کی عملی تعمیر کا سامان کر رہا ہے جب تک بادشاہ، کلیسا اور سرمایہ دار فنا نہ ہوں گے نیا جہاں کیسے پیدا ہو جہاں پیر کے مٹنے سے عالم نو کو زندگی کا سامان ملیگا۔

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود　　مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

نئی دنیا جو پردۂ تقدیر میں بن رہی ہے، تو چشم تصور سے اس دنیا کو دیکھ سکتا ہے۔ موت کی تباہ کاریوں سے دل برداشتہ نہ ہو۔ زندگی بقا چاہتی ہے، انسانیت فنا نہیں ہو سکتی اور انسانیت کی بقا کا لازمی نتیجہ ملت اسلامیہ کا عروج اور اقبال ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون اٹل ہیں۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار　　ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

خضر کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ ترک موت کے پنجے سے نکل گئے۔ مصطفٰے کمال پاشا نے یونانیوں سے ملک کو پاک کیا قسطنطنیہ پر پھر اسلامی علم لہراتا نظر آیا۔ ایران کو رضا شاہ نے بچالیا اور روسی اور انگریز دونوں اپنے اپنے حلقۂ اثر سے دست بردار ہو گئے مصر میں سعد زاغلول کی تحریک نے صدیوں کے غلاموں کو بیدار کر دیا۔ اور شام، عراق اور فلسطین میں عربوں کی آزادی کی جنگ شروع ہو گئی۔ صد ہزار انجم کے خون سے اسلام کی سحر نمودار ہوئی اور یہ حقیقت سچی ثابت ہوئی۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں　　اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اقبال تباہی میں آبادی اور موت میں زندگی کا پیام سناتا ہے۔ وہ جوہر انسانیت کا ترجمان ہے، یہ جوہر زندہ پائندہ ہے اس طرح اقبال کا پیام بھی زندگی اور پائندگی کا پیام ہے۔ وہ مرثیہ خواں نہیں بلکہ انسانیت کا حدی خواں ہے، جس کے نغموں کی تاثر کاررواں کو رفعت و ترقی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اقبال خداوند حی و قیوم کا راز داں ہے اور زندہ و پائندہ انسانیت کا ترجمان اور راہنما ہے۔

اسلامی تمدن کی روح[1]

(حافظ ضمیر الدین صاحب۔ بی اے)۔

"محمد عربی ساتویں آسمان پر معراج کو تشریف لے گئے اور واپس آ گئے خدا کی قسم اگر میں اس مقام اعلیٰ تک پہنچ جاتا تو ہرگز نہ لوٹتا"۔ یہ قول مسلمانوں کے ایک جید درویش حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ کا ہے۔ ادب تصوف کے سارے سلسلہ میں، غالباً مشکل ہی سے ایسے الفاظ ملیں گے جو اس قدر خوبی کے ساتھ ایک مختصر سے جملہ میں، اس باریک نفسیاتی فرق کو ظاہر کرتے ہوں، جو نبوت اور صوفیت کے اقسام شعور کے درمیان ہوتا ہے۔ صوفی خلوت خانۂ وحدت سے قدم نکالنا پسند نہیں کرتا اور جب اسے مجبوراً قدم نکالنا بھی پڑتا ہے تو اس کی آمد بنی نوع انسان کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتی، اس کے برعکس نبی کی دنیا میں آمد تخلیقی ہوتی ہے، اور وہ ہنگامہ حوادث میں حصہ لینے کے لئے، اس مقصد کے ساتھ واپس آتا ہے کہ وہ تاریخ کی قوتوں پر قابو پا کر خیالات کی ایک نئی دنیا پیدا کر دے۔ صوفی

---

[1] یہ مضمون ڈاکٹر اقبال کے چھ مشہور لکچروں (Reconstruction of Religious thoughts) میں سے ایک لکچر (Spirit of Islamic culture) کا ترجمہ ہے۔

کے نزدیک وحدت الوجود کا گوشہ آخری منزل ہے۔ بنی کے نزدیک وہ مقام ہے جہاں اس کی ذات میں دنیا کو ہلا دینے والی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں، جو اس عالم محسوس میں کایا پلٹ کر دیتی ہیں۔ بنی کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی تجربے کو دنیا کی زندہ قوت میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس طرح اس کی واپسی، اس کے مذہبی تجربے کی قدر کا ایک عملی ثبوت بن جاتی ہے۔ بنی کا ارادہ، خود اپنے آپ کو اور اس واقعی دنیا کو، جس کے اندر وہ معروفی حیثیت اختیار کرنا چاہتا ہے، اپنے تخلیقی فعل کی کسوٹی پر کستا ہے۔ اس خارجی مواد کو جو اس کے سامنے ہوتا ہے، سمجھنے کے لئے، نبی پہلے اپنی خودی کو آپ دریافت کرتا ہے اور پھر اسے دنیا کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔ کسی بنی کے مذہبی تجربے کی قدر کو جانچنے کا دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس انسانیت کو دیکھا جائے جو اس نے پیدا کی ہے اور اس تمدنی دنیا کو جو اس کے پیغام کی بدولت پیدا ہو گئی ہے، اس لکچر میں میں صرف آخری طریقہ اختیار کروں گا، میری یہ غرض نہیں کہ میں آپ کو علمی دنیا میں اسلام کی کارگذاریاں بتاؤں، بلکہ میں آپ کی توجہ تمدن اسلام کے چند نمایاں تصورات پر مبذول کرانا چاہتا ہوں، تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ان خیالات کا ارتقا، جو ان تصورات میں پنہاں ہیں، کیونکر ہوا، اور اس طرح اس روح کا بھی اندازہ ہو جائے، جن کا اظہار ان تصورات کے ذریعہ سے ہوا۔ قبل اس کے کہ میں اپنا مضمون شروع کردوں، یہ ضروری ہے کہ اسلام کے ایک نہایت اہم عقیدہ کی تمدنی قدر معلوم کر لی جائے۔ اس سے میری مراد ختم نبوت ہے۔

ایک بنی کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک قسم کا عارفانہ علم رکھتا ہو، جس میں تجربۂ وحدت کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک جاتا ہے اور اجتماعی زندگی کی قوتوں کو، ایک نئی راہ دکھانے اور نئی شکل دینے کے مواقع تلاش کرتا ہے، اس کی شخصیت میں، زندگی کا محدود مرکز، خود غیر محدود گہرائیوں میں صرف اس لئے ڈوب جاتا ہے کہ دوبارہ نئی قوت کے ساتھ ابھرے اور زندگی کے پرانے راستوں کو بند کر کے نئے راستے کھول دے۔ اپنی خودی کی گہرائی سے یہ تعلق کچھ انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ حقیقت میں جس طریقہ پر لفظ وحی قرآن میں استعمال ہوا ہے، وہ ظاہر کرتا ہے کہ قرآن، اس کو زندگی کی ایک عالم گیر خاصیت قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی نوعیت اور صورت ارتقار حیات کی مختلف منزلوں میں مختلف ہوتی ہے نباتات کا آزادی سے نشو ونما پا کر پھیلنا اور بڑھنا، حیوانات کا ایک نئے ماحول کے مطابق نئی شکل اختیار کرنا اور نسل انسانی کا زندگی کی اندرونی گہرائیوں سے روشنی پانا یہ سب وحی کی صورتیں ہیں جو موردِ وحی کی سیرت اور اس کی نوعی خصوصیات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں نوع انسانی کے زمانۂ جاہلیت میں، روحانی قوت میں وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے جسے میں نبوت کا شعور کہوں گا۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے کہ جوہر فرد ایک برتر قوت کے احکام اور فیصلوں پر ایمان لا کر خود فیصلہ کرنے کی ذمہ داری اور زحمت سے بچ جاتا ہے۔ عقل اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہو جانے سے، زندگی خود اپنے مفاد کے لئے شعور کے ان لاعقلی طریقوں کو دبا دیتی ہے جن کے ذریعہ سے

روحانی قوت اپنے آپ کو ارتقار انسانی کی ابتدائی منزل میں ظاہر کرتی تھی۔ انسان ابتدار میں جذبہ وجبلت کا محکوم ہوتا ہے۔ قوت ادراک جس سے انسان اپنے ماحول پر قابو پاتا ہے، اکتسابی چیز ہے اور اس کی ترقی کے لئے علم کے دوسرے طریقوں کو دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم دنیا نے فلسفہ کے بعض بڑے نظام ایسے وقت میں پیدا کئے جب انسان نسبتاً وحشت کی حالت میں تھا اور کم وبیش ترغیب کا محکوم۔ لیکن ہم کو یہ نہیں بھول جانا چاہیئے کہ قدیم دنیا میں نظام فلسفہ کی تعمیر محض مجرد خیالات کے ذریعہ سے ہوتی تھی جو صرف اتنا کرتا تھا کہ مبہم عقائد اور روایات کو ایک باقاعدہ شکل میں لے آئے۔ اس سے ہمیں زندگی کے واقعی حالات پر قابو پانے میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔

اگر اس نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام قدیم وجدید دنیا کے درمیان کھڑے نظر آتے ہیں، ان کی وحی کا ماخذ تو قدیم دنیا سے تعلق رکھتا ہے مگر اسی وحی کی روح جدید دنیا سے وابستہ ہے۔ ان کی ذات میں زندگی، علم کے دوسرے سرچشمے دریافت کرتی ہے، جو اسے نئی راہ پر چلانے کے لئے موزوں ہو۔ اسلام کا معرض وجود میں آنا، جیسا کہ میں انشار اللہ آپ کے سامنے ثابت کردوں گا، عقل کے طریقۂ استقرار کا پیدا ہونا ہے۔ اسلام میں نبوت کمال کو پہنچ گئی، یعنی اسے خود ہی اپنے ختم کی ضرورت محسوس ہوئی، اس میں اس حقیقت کا شعور پنہاں ہے کہ حیات انسانی کو ہمیشہ انگلی پکڑ کر چلانا ممکن نہیں بلکہ کامل خود شعوری حاصل کرنے

کے لئے انسان کو آخر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اسلام میں پاپائی درباریوں کی سی کسی جماعت کا اور موروثی بادشاہت کا نہ ہونا، قرآن کا عقل اور تجربہ سے بار بار خطاب کرنا اور اس پر زور دینا کہ فطرت کا مشاہدہ اور تاریخ کا مطالعہ انسانی علم کے سرچشمے ہیں، یہ سب اسی ایک تصور یعنی ختم نبوت کے مختلف پہلو ہیں، بہرحال اس تصور کے یہ معنی نہیں کہ باطنی تجربہ جو ماہیت میں نبی کے تجربے سے مختلف نہیں ہوتا، اب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ قرآن تو انفس (یعنی خودی) اور آفاق (عالم طبیعی) دونوں کو علم کے سرچشمے سمجھتا ہے۔ خدا اپنی نشانیاں باطنی تجربہ میں بھی ظاہر کرتا ہے، اور ظاہری میں بھی۔ اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا اندازہ کرے کہ تجربہ کی مختلف اقسام سے کس حد تک علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ختم نبوت کے عقیدے سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ زندگی کا آخری انجام یہ ہے کہ عقل و ادراک اور جذبات کو بالکل دور کر کے ان کی جگہ لے لیں۔ یہ بات نہ تو ممکن ہے اور نہ پسندیدہ۔ اس تصور کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے باطنی تجربہ کے متعلق ایک تنقیدی رویہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر طرح کی شخصی حکومت، جو مافوق طبیعی بنیاد پر قائم ہونے کی مدعی ہو، تاریخ انسانی میں ختم ہو گئی ہے؛ اس قسم کا عقیدہ ایک نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کی حکومت کی نفی کرتی ہے۔ اس تصور کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے باطنی تجربہ کے لئے علم کی نئی راہیں کھول دے۔ اسی طرح اسلام کے کلمۂ توحید کا پہلا حصہ انسان کے خارجی تجربہ میں تنقیدی مشاہدے کی روح پیدا کرتا ہے، اور فطرت کی قوتوں کو الوہیت کی صفات

سے، جو سابق تمدنوں نے ان کی طرف منسوب کی تھیں، محروم کر دیتا ہے۔ باطنی تجربہ کو خواہ وہ کتنا ہی غیر معمولی تجربہ کیوں نہ ہو مسلمان ایک بالکل طبعی اور معمولی تجربہ سمجھتا ہے اور جس پر اسی طرح آزادی سے تنقید کی جاسکتی ہے جس طرح اور انسانی تجربوں پر۔ یہ بات خود حضور کے ان خیالات سے واضح ہو جاتی ہے جو آپ نے ابن صیاد (Sayyad) کے روحانی تجربہ کی بابت ظاہر فرمائے تھے اسلام میں تصوف کا یہ کام رہا ہے کہ باطنی تجربات کو منظم کر دے۔ اگرچہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ صرف ابن خلدون ہی ایک ایسا مسلمان ہو جس نے اس کو کامل تنقیدی نظر سے دیکھا۔

لیکن باطنی تجربہ، انسانی علم کے سرچشموں سے ایک ہے۔ قرآن کے مطابق علم کے دو اور سرچشمے ہیں، فطرت اور تاریخ علم کے انھیں سرچشموں سے کام لینے میں اسلام کی روح کا کمال نظر آتا ہے۔ سورج، چاند، سایہ کا گھٹنا بڑھنا، دن اور رات کا اختلاف، بنی نوع انسان کے رنگ اور زبانوں کا اختلاف اور قوموں کا عروج و زوال غرض کل عالم طبعی ہیں، جس کا انسان اپنے حواس سے ادراک کر سکتا ہے، قرآن کو حقیقت کی نشانیاں نظر آتی ہیں، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے اور ان کے پاس سے اس طرح نہ گذر جائے گویا وہ "بہرا اور اندھا ہے" کیونکہ وہ شخص جو "اس زندگی میں ان نشانیوں پر غور نہیں کرتا وہ آنے والی زندگی کی حقیقتوں سے بے بصر رہے گا"۔ محسوسات پر اتنا زور اور ساتھ ہی اس کا بھی یقین کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق یہ عالم اپنی ماہیت کے لحاظ سے حرکت پذیر

اور قابل نمو ہے۔ ان عقائد نے مسلمان مفکروں کو یونانی خیالات سے کشمکش پر آمادہ کر دیا۔ جن کا انھوں نے اپنی ذہنی زندگی ابتدا ہیں بہت جوش و خروش سے مطالعہ کیا تھا، پہلے انھوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ قرآن کی تعلیمات قدیم فلسفہ کی مخالف ہیں، بلکہ انھوں نے یونانی فلسفہ پر پورا بھروسہ کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ قرآن کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں دیکھیں۔ قرآن کی روح جو محسوسات سے بحث کرتی ہے اور یونانی فلسفہ جو محض خیالی نظریوں سے بحث کرتا تھا اور واقعات کو نظر انداز کرتا تھا، دونوں کی ملانے کی کوشش ناکامیاب ثابت ہونی تھی اور ہوئی۔ ان کی ناکامیابی کے بعد جو چیز پیدا ہوئی، وہی حقیقت میں اسلامی تمدن کی روح تھی اور اس نے جدید تمدن کے بعض اہم ترین عناصر کی بنیاد رکھی۔

یونانی فلسفہ کے خلاف یہ ذہنی بغاوت خیالات کے تمام شعبوں میں دکھائی دیتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں اسی میں اس ذہنی بغاوت پر جو کہ ریاضی، نجوم اور طب میں نظر آتی ہے، کماحقہٗ روشنی ڈالنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یہ چیز اشاعرہ کے نظری خیالات میں صاف نظر آتی ہے۔ لیکن یونانی منطق کی جو مسلمانوں نے تنقید کی اس کی وہ ایک بہترین مثال ہے۔ یہ قدرتی بات بھی تھی، کیوں کہ محض خیالی فلسفہ سے بے اطمینانی کا لازمی نتیجہ تھا کہ علم کے یقینی طریقے کی تلاش کی جائے۔ میرے خیال میں یہ نظام تھا جس نے سب سے پہلے شک کو تمام علوم کی ابتدا قرار دیا۔ غزالی نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں اس کی توسیع کر دی اور (DESCARTES) ڈی کارٹ کے

طریقہ کے لئے راہ ہموار کر دی۔ لیکن منطق میں غزالی مجموعی طور پر ارسطو کے پیرو رہے، اپنی "قسطاس" میں چند قرآنی دلائل کو ارسطو کی منطقی اشکال میں پیش کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ سورۂ شعراء میں اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے کہ نبیوں کی مخالفت کرنے سے عذاب نازل ہوتا ہے، تاریخی مثالوں سے پیش کرنے کا سیدھا سادا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اشراقی اور ابن تیمیہ تھے جنھوں نے یونانی منطق کی باقاعدہ طور پر تردید کی۔ شاید ابو بکر رازی پہلے شخص تھے جنھوں نے ارسطو کی پہلی منطقی شکل کی تنقید کی اور خود ہمارے زمانہ میں جان اسٹوارٹ مل نے اسی اعتراض کو اصول استقراء کے مطابق ایک مکمل صورت میں ظاہر کیا ہے۔ ابن حزم اندلسی اپنی کتاب (SCOPE OF LOGIC) میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حواس علم کا ایک سرچشمہ ہیں اور ابن تیمیہ اپنی کتاب، ابطال منطق میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ صرف استقراری استدلال کا قابل اعتماد طریقہ ہے اور اس طرح تجربے کا طریقہ پیدا ہو گیا، یہ محض نظری بحث نہ تھی۔ البیرونی کی تحقیق جو مدت رد عمل کہلاتی ہے۔ اور الکندی کی تحقیق کہ حس، محرک کے تناسب ہوتی ہے؛ نفسیات میں اس نظریہ کے استعمال کی مثالیں ہیں۔ یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ تجربی طریق یورپ میں دریافت کیا گیا ہے۔ DHAINA کہتا ہے کہ راجر بیکن کے سائنس کے تصورات بہت زیادہ صحیح اور واضح ہیں بہ نسبت ان تجربات کے جو اس کے مشہور ہم نام فرانسس بیکن نے کئے اب سوال یہ ہے کہ راجر بیکن نے سائنس کی تعلیم کہاں سے

حاصل کی ظاہر ہے کہ اسپین کی اسلامی یونیورسٹیوں میں حقیقت میں اس کی کتاب MAJUS کا پانچواں باب جو "منظر" PERSPECTIVE کے متعلق لکھا گیا ہے۔ بالکل ابن ہشیم کی کتاب "مناظر و مرایا" کی ہو بہو نقل ہے۔ مجموعی طور پر اس میں ابن ہشیم کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ یورپ نے بہت دیر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ اس کا سائنٹفک طریقہ مسلمانوں سے ماخوذ ہے لیکن آخر کار اس کا کامل اعتراف کر لیا گیا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں برفالٹ BRIFFAULT کی کتاب تشکیل انسانیت[1] سے ایک یا دو ٹکڑے نقل کروں۔

"آکسفورڈ اسکول میں راجر بیکن نے ان کے جانشینوں سے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کئے۔ نہ تو راجر بیکن اور نہ اس کے بعد اس کا اہم نام اس تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تجربی طریق ایجاد کیا۔ راجر بیکن نے صرف یہ کیا کہ مسلمانوں کے علوم اور ان کے طریق کو مسیحی یورپ میں پہنچایا اور اس نے اس بات کا اعلان کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا کہ عربی زبان اور عربی علوم کا سیکھنا، اس کے ہمعصروں کے لئے، صحیح علم حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ یہ بحثیں کہ تجربی طریق کا موجد کون ہے، اُس عظیم الشان غلط بیانی کا ایک جزو ہیں جو یورپی تہذیب کی اصلیت کے متعلق کی جاتی ہیں۔ بیکن کے وقت میں عربوں کا تجرباتی طریق تمام یورپ میں عام تھا اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔"

"عربوں کی تہذیب سے موجودہ عہد کو جو سب سے بڑا حصہ

---

[1] MAKING OF HUMANITY

ملا ہے وہ سائنس ہے، لیکن یورپ میں اس سے بہت بعد کو فائدہ اٹھایا گیا۔ جب اندلس میں عربوں کا تمدن تاریکی میں چھپ گیا اس کے ایک طویل عرصہ کے بعد یورپ کا وہ عظیم الشان تمدن جو اسی عربی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے، ظہور میں آیا۔ یہ صرف سائنس ہی نہ تھی جس نے یورپ کو نئی زندگی بخشی بلکہ کثرت سے تمدن اسلام کے ایسے اثرات ہیں جنھوں نے یورپ کی زندگی کو پہلے پہل تہذیب کی روشنی سے منور کیا۔"

مومن کی بانگِ اذان

(محمد عبدالملک صاحب متعلم بی اے)

دوسروں کے لئے مرنے کی جو تڑپ اقبال کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے اس کا سرچشمہ دراصل عشق و محبت کی وہ آگ ہے جو کُل انسانوں کے لئے اس کے دل میں بھڑک رہی تھی، اور اسی کا اثر تھا کہ وہ کہہ اُٹھا:۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اپنی زندگی کے لئے اس کے نزدیک ایک ہی معنی ہیں کہ دوسروں میں زندگی پیدا کر دے۔ درد بھرے دل کی یہ تمنا خدا کے حضور میں اس طرح پیش ہوتی ہے ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

شمع بننے کی دعا اور اپنے چمکنے کی یہ تمنا، ایک فطری آرزو ہے، مگر کس لئے؟ روشنی میرے قبضہ میں ہو جب چاہوں لوگوں کو تاریک کر دوں، اجالا میرے تصرف میں ہو، جو مجھے نہ مانیں اندھیرے میں دھکیل دوں، اپنے منوانے کا یہ جذبہ نہ بھی ہو تو کم سے کم یہ سب ہی چاہتے ہیں کہ "رونق محفل" کہلائیں لوگوں کے محسن کہلائیں مگر اقبال کے ہاں چمکنے کی یہ تڑپ بالکل نرالی ہے،

وہ جینا چاہتا ہے۔ صرف جلانے کے لئے وہ چمکنا چاہتا ہے صرف چمکانے کے لئے وہ روشن ہونا چاہتا ہے مگر صرف اس کے لئے کہ دوسروں کو روشن کر سکے، وہ منور ہونا چاہتا ہے مگر صرف اس لئے کہ دوسروں کو منور کر دے اور اگر دوسروں میں زندگی مرنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، دوسروں میں چمک گھلنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے تو اس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہے اور رفیق طریق کو تیار کر رہا ہے ؎

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں
اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط　　اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں

دنیا جانتی ہے کہ اقبال کی زندگی شمع ہی کی مانند گذری، انھوں نے اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا میں اجالا کر دیا خود قوم کے عشق میں پگھل پگھل کر ختم ہو گئے مگر دوسروں کی زندگی کو زندگی بنا دیا۔ اپنی ہستی کو چھپاتے چھپاتے تاریک کر دیا مگر لوگوں کی دلوں کی بستی کو منور کر گئے۔ انھوں نے ساری عمر کمایا اور خوب لٹایا۔ کمائی کے خاص جواہر ریزے، فیاضی کے باوجود بھی آدمی محفوظ رکھتا ہے مگر تاکے! اقبال کی دولت تو لٹانے ہی کے لئے تھی، اس متاع فقیر کے لٹنے کا تماشا بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ ساقی نامہ میں اپنے لئے دعا مانگی ہے، جس میں شاعر شراب کہن مانگتا ہے، تڑپنے پھڑکنے کی توفیق مانگتا ہے، دل مرتضیٰؓ اور سوز صدیقؓ مانگتا ہے۔ یہ سب کچھ تو اپنے لئے اس لئے کہ اس کا ظرف بڑا ہے۔ اسے اگرچہ بہت کچھ مل چکا ہے مگر وہ طلب خیر میں حریص واقع ہوا ہے ــــ لیکن جو کچھ مل چکا ہے دوسرے اس سے محروم ہیں، اس لئے اپنے اس

سارے خزانہ کو قافلہ میں لٹا دینے کی دعا مانگتا ہے، یعنی متاع اقبال بدست خدا اور براہ خدا، لیکن اس کے باوجود بھی الحاح وزاری اور واسطہ پر واسطہ سے

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری- آرزوئیں مری — امیدیں مری، جستجوئیں مری
مری فطرتِ آئینۂ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہ حیات — گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

لٹنے لٹانے کا سلسلہ اس سے پہلے بھی رہا ہے، لیکن ایک تو وہ تھے جو لٹنے کے بعد دل کو تسلی دیا کرتے تھے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اور ایک وہ، جو خود دونوں ہاتھوں سے لٹایا کرتے تھے مگر جزا رحسنہ کی بنا پر مطمئن تھے۔

میں دے سکے تری راہ میں سب دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

مگر لٹانے کی وہ تڑپ اور لٹنے کی وہ آرزو جو اقبال کے ہاں ہے

وہ کہاں! وہ تو جگر کا خون دے دے کر بوٹے پالتا ہے اور صرف اس لئے پالتا ہے کہ اس سے گلشنِ اسلام کی بہار دوبالا ہو۔

اقبال کو شمع سے اس درجہ تعلق ہے کہ وہ یہی دعا مانگتا ہے کہ خدا اُسے شمع صفت بنا دے یعنی اسے توفیق دے کہ دوسروں کے لئے اپنی ہستی کو مٹا دے۔ لوگوں کو اس سے فیض پہنچے۔ اندھیری راتوں میں آسمان کی شمعیں تارے ہیں اور اسی لئے اقبال کو پیارے ہیں۔ شب زندہ دار دُنیا کی غافل ومجہول بستی میں وہ نفوس قدسی ہیں جو شمع کی طرح روشن ہیں۔ اور اسی کے لئے اقبال ان کا پروانہ۔ وہ اگر سیاہ خانۂ عالم میں مسافر کو منزل کا پتہ دیتے ہیں تو یہ ظلمت کدۂ ہستی میں سبل السلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی طرح اسے دنیا کی ہر وہ ہستی، ہر وہ قوم اور ہر وہ ملت محبوب ہے، جس کے سر میں نوعِ انسانی کو سنوارنے کا سودا ہو اور جس کے دل میں بنی آدم کی خدمت کرنے کی لگن۔ اقبال کا یہ سودا اور اس کی یہ لگن اسے تاریخ عالم کی ہر ہستی کے پاس لے گئی اور اس نے ہر اس شخص کو اپنی محبت وعقیدت کا تحفہ پیش کیا جس کے دل میں انسانوں کے لئے رحمت نظر آئی شوق والفت نے ہر اُس در پر سر نیاز خم کیا جہاں رحم وکرم کی نمود پائی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دور ہر راہ رو کے ساتھ چلا لیکن دیکھا کہ کسی کی محبت چند افراد پر ختم ہے کسی کی محض اپنی بستی پر، کوئی قوم کا متوالا ہے اور کوئی ملت کا سودائی، اور ایسے بھی تھے جن کی محبت سارے عالم کو محیط تھی لیکن وہ جس کی رحمت کے لئے ہمارے سارے بحر و بر تنگ ہو گئے اور ضرورت ہوئی دوسرے عالم کی، وہ رحمۃ اللعالمین کی ذات تھی اس کی بارگاہ سے اقبال جاتے تو

کہاں جاتے، بس یہیں کے ہو رہے اور اس ہادیِ دین ہدیٰ کے قدموں میں ایسے گرے کہ پھر کبھی نہ اٹھے اور جب وہ نہ اٹھے تو معرفت کے پردے اٹھے اور نظر آیا ؎

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

یہی نہیں بلکہ ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طاہا

آفتاب ظاہری کائنات کا روشن ترین کرّہ ہے، مفلس کے چراغ اور جنگل کے جگنو کو اس کرہ عالمتاب سے شاید وہ نسبت بھی نہیں جو ذرہ کو ہے اس لئے کہ ذرہ میں تو خون خورشید موجود ہے۔ ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

لیکن اس بے نسبتی کے باوجود بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ٹمٹماتے ہوئے دیے اور بجھے بجھے سے چراغ بھی اپنی اپنی جگہ آفتاب نہیں ہیں اور سورج ہی نہیں بلکہ پورے نظام شمسی کے باوجود بھی دنیا میں دیے اور چراغ کا وجود لازمی ہے اور لابدی اقبال کا ذوق تلاش آفتاب رسالت کی رحمت ہی کیسے بس کرتا آفتاب اُسے مل گیا تھا ضرورت تھی، ستاروں کی نگاہیں تلاش میں تھیں کہ معلوم ہوا۔

لا الٰہ گویاں چوں انجم بے شمارے
بستہ چشم اندر ظلام روزگارے

یہ جماعت افراد انسانی کا وہی گروہ ہے جس کو رحمت عالم نے ایمان وعمل کے سانچوں میں ڈھالا اور اپنی رحمت کے نور سے ان دلوں کا چراغ روشن کیا اور امر ونہی کی مشعلیں دے کر حکم دیا کہ دنیا کی ہر ظلمت کو نور بنا دو، لیکن وہ نور جو محبت سے خالی ہو نار سے بدتر۔ اس لئے ان کے دلوں میں تمام انسانوں کی محبت بٹھائی تاآنکہ دُنیا نے دیکھا ؎

فطرت مسلم سراپا شفقت است — درجہاں دست وزبانش رحمت است

صرف رحمت وشفقت ہی نہیں، خالق ومخلوق کے عشق کی تعلیم دی اور اس حد تک کہ ع

مسلم ار عاشق نہ باشد کافر است

اب یہی مسلم ہے جو کہیں کوکب ہے اور کہیں قندیل ؎

قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے — جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

بندۂ رحمت میں محبت اور نور کے ساتھ کچھ اور بھی ادائیں ہونی ضرور تھیں وہ سب اس میں موجود ہیں ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین — اور یہ عالم تمام وہم وطلسم ومجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اس کی ہر ادا میں غضب کی دلفریبی ہے اور اس کے ہر انداز میں بلا کی دلکشی اس کے ہر اشارہ میں حسن ہے اور اس کی ہر صدا میں جمال۔ اس کا ہر اشارہ من اللہ ہے اور اس کی ہر صدا الی اللہ اس کی ہر ادا من الحق اور اس کا ہر انداز الی الحق اس کا ہر قول خیر کی دعوت ہے اور اس کا ہر فعل ہدایت کی راہ اس کی ہر ادا میں ایک سوز ہے اور اس کی ہر صدا میں ایک تڑپ لیکن بے شمار صداؤں میں وہ صدا، بے پناہ نعروں میں وہ نعرہ، بے نہایت پکاروں میں وہ پکار جس میں بگڑوں کو سنوارنے کی تڑپ ہے بے طرح، جس میں سوتوں کو جگانے کی لگن ہے بے محابا، جس میں غافلوں کو ہشیار کرنے کا سوز ہے بے تحاشا، وہ کیا ہے؟ مرد مومن کی بانگ اذاں ؎

کیا اس نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں اذان سحر میں

یہی نعرہ ہے جو نفرت و حقارت کی ساری دنیا کو ہلا ڈالتا ہے اور ظلم و طغیان کی بستیاں ویران، وحشت و بربریت کے قلعے برباد، کفر و باطل کے محلات تباہ اور جہل و ستم کی تاریکیاں نابود کرتا ہوا صبح سعادت کا اعلان کرتا ہے ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اذاں جس طرح جہاں اکبر کے لئے انقلاب انگیز ہے اسی طرح جہاں اصغر کے لئے بھی۔ انسان جب دنیا کے علمی سراب کی خاطر سب کچھ کھو چکا ہو، جب فلسفہ کے طلسمات نے اس کی ساری قوتوں کو محصور کر لیا ہو، اس وقت

زندگی کے منتشر شیرازہ کو جمع کرنا اس میں زندگی کی روح پھونکنا اور زندگی کو قائم و باقی اور محکم و استوار بنانے کے لئے دستور حیات مہیا کرنا بھی اس اسم اعظم کا کام ہے ؎

ہیکل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی — کس طرح خودی ہو لازمانی
آدم کو ثبات کی طلب ہے — دستور حیات کی طلب ہے
دُنیا کی عشا ہو جس سے اشراق — مومن کی اذاں ندائے آفاق

ہر بچہ کی طرح مرد مومن کی دلیل بھی اذاں ہے مگر ایں گویند از عین حیات، بچہ محض شکم مادر کو شکست کرتا ہے اور یہ ظلم و ناانصافی کی ساری دنیا کو توڑ کر پھینک دیتا ہے ؎

زادن طفل از شکست اشکم است — زادن مرد از شکست عالم است
ہر دو زادن را دلیل آمد اذاں — آں بلب گویند ایں از عین جاں

رات کو جب ساری دنیا سوتی ہے اور جاگنے والے تارے غافل انسان کی تیرہ بختی پر یہی طعنہ زنی کرتے ہیں اور اس کرمک شب کور کو منہ لگانے کے قابل بھی نہیں سمجھتے، یہی صدا بلند ہوتی ہے اور دنیا میں ایک بیدار و بیدار کن قوم کے وجود کا یقین دلا کر، ان بالا نشینوں کا منہ بند کر دیتی ہے ؎

اک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے — آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر — ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا — اس کرمک شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی — تم شب کو نمودار تو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے — اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پُراسرار

آغوش میں اس کے وہ تجلی ہے کہ جس میں | کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار
ناگاہ فضا بانگ اذاں سے ہوئی لبریز | وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار

اپنی اصلاح اور دوسروں سے بے اعتنائی، اپنی آرائش اور دوسروں سے بے پروائی اپنی تحسین اور دوسروں سے غفلت، اپنی تجمیل اور دوسروں سے بے فکری اقبال کے نزدیک ایسا گناہ ہے جو جمادات و نباتات ہی میں پایا جا سکتا ہے خدامستوں کا تو یہ شیوہ ہے کہ وہ حسن و آرائش کی تمناؤں کا علم ہاتھ میں لئے کائنات کے طول و عرض میں جمال و کمال اور بیداری و ہشیاری کے نعرے بلند کرتے چلے جائیں۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست | یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

موذن دنیا کی سب سے بڑی صداقت کا منادی ہے، وہ کائنات عالم کو بار بار وہ صداقتیں یاد دلاتا ہے جن پر کائنات کا سارا کارخانہ قائم ہے۔ خیر و فلاح کی اس نعمت کی طرف ہر کہ و مہ کو دعوت دیتا ہے جو انسان کی کامرانی و سرخروئی کی معراج ہے، لیکن کونسی نعمت ہے جسے دنیا بآسانی قبول کر سکی ہے؟ کونسی صداقت ہے جسے لوگوں نے بلا اکراہ مان لیا ہے؟ محض سقراط کی موت اس راہ میں واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر دور اور ہر عہد میں ہمیں حق پر مرنے والوں کی بے شمار فہرستیں ملتی ہیں اور حق کی صفت جب (مُر) قرار ہی پا گئی تو کون ہے جو اس جام تلخ کو برضا و رغبت قبول کرلے! مومن کی یہ صدائے ایمانی جب بلند ہوتی ہے کفر و جہل کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ اس کی صدائے حق دنیا کی باطل صداؤں کو پارہ پارہ کرتی ہوئی کائنات عالم میں گونج جاتی ہے اور پیام رحمانی ساری دنیا کو سنا دیتی ہے۔ جب

موذن کی وسعتیں دو عالم کو محیط ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خیر پھیلتا چلا جائے اور شر خاموش رہے! باطل کا شور و غوغا نمودار ہوتا ہے، سرکشی و طغیانی شروع ہوتی ہے، ضرب و حرب کا معرکہ جاری ہو جاتا ہے لیکن موذن اگر مومن ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا، اس کی قوت ایمانی راہ کے کانٹوں کو پھول، مقابلہ کی صعوبت کو راحت، میدان رزم کو بزم آدرہی نہیں بلکہ تلخابۂ اجل کو آب حیات بنا دیتی ہے اور وہ اپنی صداؤں سے باطل کی سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتا ہوا اذان کی نہریں جاری کر دیتا ہے اور یہی نہریں ہیں جو وقت آنے پر ظالموں کے لئے سیل فنا کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر اس سیلاب کی روانی مشرق سے مغرب تک کسی کے روکے نہیں رکتی ؎

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

فخر و مباہات مرد مومن کا شیوہ نہیں، نوع انسانی کی کوئی خدمت انجام پا گئی تو اس میں توفیق الٰہی شامل تھی مگر ہاں! انسان انسان ہے کبھی کبھی زبان پر آجاتا ہے ؎

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

اور پیام رحمانی پہنچانے کے لئے انسانی آبادیوں کی تلاش میں ؎

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

انسانی خدمت کے اس اعلیٰ ترین کردار کی بنا پر سحر جگانے والے کو مؤذن کہتا ہے۔ غنچۂ گل کی چٹک سے سارے گلستاں کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس کی بیداری

کا نعرہ سب کو بیدار کر دیتا ہے، اس لئے وہ بھی موذن ہے۔ صبح کی سواری آتی ہے تو غنچہ گل سے یوں مخاطب ہوتی ہے ؎

پکاری اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچۂ گل! تو موذن ہے گلستاں کا

کوئل کی کوک سے سارے چمن میں بیداری کی رو پیدا ہو جاتی ہے، سارا گلستاں ترانوں سے گونج اٹھتا ہے۔ ہر وہ نغمہ جو وقت آنے پر سونے والوں کو جگا دے، اذان ہے ؎

جاگے کوئل کی اذاں سے طائراں نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار

کائنات ارضی و سماوی کو اگر رحمت کے عنصر سے محروم کر دیا جائے تو کون و مکان کی کوئی شے قائم و باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر خطہ ارضی خیر سے خالی ہو جائے تو دنیا میں شر و فساد کی قیامت آ جائے اس لئے اقوام عالم میں ایک گروہ انسانی کو آب حیات پلانا بھی ضروری تھا اور بقا اسی کا حصہ ہے جس کو عشق الٰہی اور محبت انسانی نے دوسروں کے لئے مرنا سکھایا اور جس میں خلیل و موسیٰ کی اداؤں نے ظہور پایا ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل

اور جب مسلمان کو اذان کے صدقے میں آب بقا ملا تو اذان کی فنا کیسے ممکن! یہ نغمہ سرمدی تو جاری ہے اور جاری رہے گا ؎

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر

دنیا جانتی ہے کہ یونانیوں کا عروج و کمال، رومیوں کا حسن و جمال، ایرانیوں کا جاہ و حشم، ساسانیوں کے طبل و علم اور مصریوں کے خیل و خدم سب ہوئے راہی ملک عدم مگر ع

بانگ اذاں بود ست وہست

رومیاں را گرم بازاری نماند　　آں جہانگیری جہاں داری نماند
شیشۂ ساسانیاں درخوں نشست　　رونق خمخانۂ یوناں شکست
مغرب، ہم در امتحاں ناکام ماند　　استخوانِ او تہ اہرام ماند
درجہاں بانگ اذاں بود ست وہست
ملت اسلامیہ بود ست وہست

اقبال میں جب روح بلالی بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ دنیا سو رہی ہے اس پر جمود طاری ہے، دل کی آنکھیں بند ہیں، ذہن خوابیدہ ہیں، احساس مردہ ہے، اس سے نہ رہا گیا اور دلِ بے تاب کے نالوں نے اذاں کی صورت اختیار کر لی۔

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

اے غنچۂ خوابیدہ چوں نرگس نگراں خیز　　کاشانۂ ما رفت بتاراج غماں، خیز
از نالۂ مرغ چمن از مرغ اذاں خیز　　از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

یہ غنچۂ خوابیدہ کون ہے؟ وہی جس کے چٹکنے سے سارا گلستاں جاگ جاتا ہے۔ دنیا میں بیداری وہشیاری کا پیامی، انسانوں کا وہی گروہ ہے جو رحمۃ للعالمین کے نور سے نورانی ہوا۔

اور اسی لئے وہ امین ناموس ازل ہے اگر اقوام عالم کے یہ مؤذن

جاگ جائیں تو پھر دنیا میں کون ہے جو سوتا رہ جائے؟ اسی لئے اقبال کا ہر تار نفس یہی اذان تھا:۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقین در کش و از دیر گماں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

ساقی نامہ

(مسعود حسین خانصاحب متعلم بی اے)

ساقی نامہ نظم کی وہ صنف ہے جس میں شاعر اپنے خیالات و محسوسات تیز کرنے کے لئے ساقی سے شراب کا طالب ہوتا ہے خواہ وہ بادۂ الست ہو یا دختر رز، اور شراب پی کر مست ہو جانے کے بعد وہ اپنے جذبات و کیفیات کو صفحہ قرطاس پر منظوم کرتا ہے۔ اقبال کا ساقی نامہ سات حصوں میں منقسم ہے جسے ہم تفصیل کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اقبال اپنے پر زور بیان سے پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے مناظر قدرت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔ بہار کا موسم ہے۔ نرگس اور لالہ کی کثرت نے دنیا کو جامۂ رنگین پہنا دیا ہے ؎

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں　　لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا کی رنگینی اور ہوا کا سرور طائروں کو آشیانوں میں ٹھہرنے نہیں دیتا ہے۔ اس کے بعد شاعر دریا کی روانی کو ذرا وضاحت سے بیان کرتا ہے، اس کی فلسفیانہ نگاہیں دریا کی قوت اور مسلسل حرکت دیکھ کر حقیقت کی تہ کو پہنچنا چاہتی ہیں۔ وہ اس میں راز زندگی دیکھتی ہیں ؎

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام　　سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

شاعر کی خواہش ہے کہ وہ ایک ایسی مے پئے جو اسرار کائنات کے ابدی سیاہ پردوں کو شق کر دے اور جس سے حقائق حیات اس کے

سامنے روشن ہو جائیں۔
شاعر سیاست کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زمانے نے تمام سیاسی نظاموں کو باطل ثابت کر دیا، سامراجی اور سرمایہ داری نظام ختم ہو چکے ہیں۔

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

فی زمانہ دنیا کی تمام غلام قوموں میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں، مگر مسلمان ابھی تک ' روایات ' کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، ان کے دلوں سے ذوق و شوق اور تڑپ اور محبت بالکل مفقود ہے جو قوم دنیا میں رہنما بن کر آئی تھی وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں پھنس گئی اور اس نے اپنے اصلی مقصد کو بالکل فراموش کر دیا ؎

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں فرد — محبت میں یکتا، حمیت میں مرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک ' مقامات میں کھو گیا

مسلمانوں کی اپنے مذہب سے دوری اور ان کی افتادگی شاعر کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے ؎

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مسلمانوں کی پستی دیکھ کر اقبال کا دل بھر آتا ہے اب وہ ساقی سے شراب کہن (شراب عشق) مانگتا ہے، خود پینا چاہتا ہے اور نوجوانوں کو پینے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ شوق عمل کو خرد کی غلامی سے آزاد دیکھنے کا متمنی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے ' دل مرتضیٰ ' اور ' سوز صدیق ' مانگتا ہے، ان کے سینوں میں عزم اور تمنا پیدا ہونے کی دعا کرتا ہے۔ اپنا سوز جگر

جوانوں کو بطور تحفہ دینا چاہتا ہے، خودی اور اسرار زندگی سمجھانے کا خواہشمند ہے۔ مسلمانوں کے قافلہ میں اپنی ساری متاع، اپنی امیدیں، اپنی آرزوئیں، اپنی جستجوئیں، اپنی بے تابیاں، اپنی بے خوابیاں لٹانے کے لئے بے قرار ہے سے

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　مری خلوت و انجمن کا گداز،
امنگیں مری، آرزوئیں مری،　　امیدیں مری، جستجوئیں مری
مری فطرت، آئینۂ روزگار　　غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہ حیات　　گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلہ میں لٹا دے اسے!
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے!

اقبال کا قلم اب اپنے پسندیدہ موضوع یعنی فلسفۂ زندگی پر جولاں ہوتا ہے۔ فلسفۂ زندگی کو اقبال سے بہتر اردو شاعروں میں شاید ہی کسی نے سمجھا ہو۔ راز حیات، دراصل اقبال کا پیغام ہے جسے اس نے سالہا سال کی جگر سوزی اور اشک ریزی کے بعد سمجھا ہے اور جسے وہ دوسرے کے کانوں تک پہنچانے کے لئے بے تاب ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق دنیا کی ہر شے سے زندگی عیاں ہے اور گو وہ اس تنِ خاکی میں صورت پذیر ہوئی مگر اس سے بے نیاز ہے۔ وہ سب چیزوں میں موجود ہے تاہم کسی میں بھی نہیں کیونکہ وہ اپنی انفرادی حیثیت ہمیشہ قائم رکھتی ہے، رنگینئ عالم اس کی مرہون منت ہے چنانچہ سے

یہ عالم، یہ بت خانۂ شش جہات　　اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

زندگی کی ہمہ گیری بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا کی ہر چیز میں کیا چھوٹی اور کیا بڑی موجود ہے۔

آگے چل کر فلسفہ زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔ جد و جہد، کشمکش، اور جستجو زندگی ہی کے مختلف نام ہیں۔ ایک جگہ شاعر یوں لکھ چکا ہے ع

"زندگی در جستجو پوشیدہ است"

بادی النظر میں دکھائی دے یا نہ دے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر ذرّہ کائنات میں تڑپ اور اضطراب ہے۔ رازِ حیات کو شاعر نہایت لطیف پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز　　سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں، کاروانِ وجود　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند　　سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

اقبال کے پیر و مرشد مولانا رومؒ کئی سو برس پہلے یہ سبق پڑھا چکے ہیں ع

"صدر را بگذار صدر تست راہ"

اقبال کے نزدیک زندگی اور خودی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فلسفۂ زندگی بیان کرنے کے بعد فلسفۂ خودی پر آجانا ایک لازمی امر ہے۔ خودی زندگی کا جوہر ہے۔ اور دُنیا کی روح، اس پر ہر شے کی زندگی کا انحصار ہے ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

یہ موجِ نفس کیا ہے، تلوار ہے | خودی کیا ہے، تلوار کی دھار ہے

خودی، بدمست جلوہ ہو کر بھی اپنی انفرادیت ختم نہیں ہونے دیتی اور گو بظاہر مقید، تمام قیود اور بندھنوں سے مبرّا ہے۔ زمانے کے حادثات اس میں تغیرات پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیشہ معراجِ حق کی متلاشی ہے۔ خود ایک زبردست قوت بھی ہے ؎

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں | پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

اور زندگی کی طرح جدوجہد اور کشمکش اس کے لئے بھی ضروری ہیں۔ دوسری چیزوں میں سموئے ہوئے ہونے کے باوجود اپنی وحدت اور یکتائی نہیں کھوتی اور اپنے آپ کو دوسری چیزوں میں ہمہ تن جذب نہیں ہونے دیتی ؎

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں | یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

انسانی قلب اس کی ہنگامہ آرائی کی جگہ ہے۔

آخر میں شاعر بتاتا ہے کہ خودی نان کی خاطر نہیں بیچی جا سکتی ہے۔ خودی صرف خدا کے (بمعنی دیگر خود اپنے) سامنے سرنگوں ہو سکتی ہے۔ اس ذاتِ اعلیٰ کو سجدہ کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ کسی دوسری ذات کے سامنے سر نہ جھکے ؎

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام | کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

اس سرائے فانی کو قیام گاہ مستقل نہ سمجھنا چاہئے اور انسان کو اسی دنیا کا ہو کر نہ رہ جانا چاہئے، کیونکہ ؎

تری آگ اس خاکداں سے نہیں | جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں | مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

انسان کو لازم ہے کہ وہ مکان وزمان پر قابو پائے نہ کہ ان میں محصور ہو کر رہ جائے۔ اس دنیا میں انسانی ارتقا ایک عظیم الشان مقصد کی طرف پہلا قدم ہے۔ انسان کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے قبل ابھی بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں۔ یہاں اس مقصد کا صرف یہیں تک ہے کہ اپنی خودی کو سمجھ لے۔ بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی یہ سب انسانی فکر کے تراشے ہوئے بت ہیں ؎

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت　　تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

الغرض جب شاعر کا قلم اس میدان میں جولاں ہوتا ہے تو وہ اس کے جذبات و خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے اور مجبوراً شاعر سعدیؒ کا یہ شعر پڑھ کر قلم رکھ دیتا ہے۔

اگر یک سر موئے، برتر پرم　　فروغ تجلی بسوزد، پرم

اقبال کے کلام میں "ساقی نامہ" کی کیا حیثیت ہے؟ اس سوال کا جواب لکھنے کے لئے صفحات درکار ہیں۔ اس کے لئے اقبال کی دوسری مشہور نظموں سے موازنہ کرنا ہوگا۔ بانگ درا کی چند مشہورِ عالم نظمیں مثلاً شمع و شاعر، شکوہ، طلوع اسلام وغیرہ جو اقبال نے جوانی کے زمانے میں لکھی تھیں، باعتبار زور و قوت خیال اور شعریت بہت بلند پایہ ہیں۔ ساقی نامہ میں شاعری کم ہے اور اظہار حقائق زیادہ، شعریت و تخلیق حسن پرشوکت الفاظ اور بار خیالات کے نیچے دب گئے ہیں۔ یہاں شاعر خلاق حسن نہیں ہے بلکہ ترجمان حقیقت۔ ساقی نامہ پڑھتے وقت دوسری چیزوں کی بجائے نفس مضمون پر نگاہ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے ساقی نامہ کی ایک دوسری بڑی

صفت اس کا اختصار ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں بتانے کی کوشش کی گئی ہے، حتیٰ کہ بعض جگہ اقبال بعید الفہم ہو گیا ہے مگر

"حقیقت یہ ہے جامۂ حرف تنگ"

تمام اصناف شاعری کی پہنائی میں اقبال کا سودا نہیں سما سکتا ہے اور یہاں اردو کی کم مائگی ظاہر ہوتی ہے۔ زبان آسان ہونے کے باوجود فصیح و بلیغ ہے اور فلسفہ کے ادق مسائل کو رنگین عبارت سے ڈھانکا گیا ہے الغرض ساقی نامہ کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اقبال کے کلام میں ساقی نامہ بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور بال جبریل میں بجز "مسجد قرطبہ" کے کوئی نظم اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔

اقبال کے سو شعر

(محمد طیب فاروقی - بی - اے جامعہ)

"کسی شاعر کے کلام سے انتخاب کرنا اتنا دشوار کام ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ پھر انتخاب محدود کر دیا جائے چند اشعار تک، تو یہ کام اور زیادہ نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ کلام اقبال اردو کے دوسرے شعراء کے کلام سے بالکل جدا اور ایک نئی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کے شعر محض شعر نہیں بلکہ اس روح کی آوازیں ہیں جو اپنی تڑپ اور اپنی بےچینی سے اُن لاکھوں روحوں کو بے چین و مضطرب کر دینا چاہتے ہیں جو پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس اور مطمئن ہیں۔ ان کا کلام سر تا سر ایک فلسفۂ زندگی ہے جسے انھوں نے شعر و جدان کے ملبوس رنگ میں پیش کیا ہے۔ انتخاب کرنے والے کی دشواری اس جگہ اور بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ ممکن ہے نگاہ انتخاب لباس کی رنگینی میں جذب ہو کر رہ جائے اور اس روح سے اثر پذیر نہ ہو جس کے لئے وہ لباس تیار کیا گیا ہے۔

اقبال کی شاعری کئی ادوار سے گذر کر اس منزل پر پہنچی ہے، جہاں اس پر "جزو لیست از پیغمبری" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اقبال پہلے ایک خوش گو شاعر تھے، پھر قوم کے درد نے انھیں قومی شاعر بنایا، لیکن ان کی دور رس نگاہ نے دیکھا کہ قوم سے زیادہ انسانیت کرب و ابتلا کے دور سے گذر رہی ہے، ایسی صورت میں ایک قوم کا ماتم خود غرضی ہے، چنانچہ انھوں نے انسانیت کو اپنے کلام کا موضوع بنایا اور اس کے درد کا مداوا تلاش کر لیا۔

اقبال کے کلام کا یہ انتخاب شعر کی معنوی اور فنی خوبیوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس مقصد کے لحاظ سے کیا گیا ہے جو شاعر کا مقصود نظر تھا، زیادہ توجہ ان اشعار پر دی گئی ہے جو فلسفۂ خودی سے متعلق ہیں، لیکن بایں ہمہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ انتخاب کامیاب ہے، اتنا ضرور ہے کہ میری اپنی تسکین کے لئے ایک حد تک کافی ہے۔

دو صد داناں دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تراز برگِ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو　　خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں　　تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق　　طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں　　یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ　　خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے　　دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر　　وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سبق
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہی از ہائے و ہو میخانہ بودے
گل ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق
اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

مسلماناں مرا حرفے است در دل
کہ روشن تر ز جانِ جبرئیل است
نہانش دارم از آذر نہاداں
کہ ایں سرے ز اسرار خلیل است

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

دل از منزل تہی کن، پا بره دار
نگہ را پاک مثل مہر و مہ دار
متاع عقل و دیں با دیگراں بخش
غم عشق ار بدست افتد نگہ دار

بخود نازم گدائے بے نیازم
تپم، سوزم، گدازم، نے نوازم
ترا از نغمہ در آتش نشاندم
سکندر فطرتم آئینہ سازم

متاع معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
ز موراں شوخی طبع سلیمانی نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا　　قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا　　ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی　　موسیقی و صورت گری و علم نباتات

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر　　شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز　　زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا　　کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں　　یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز　　یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی　　یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار　　غلامی سے ہے بتر بے یقینی

چیونٹی
میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

عقاب
تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

میخانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں　　لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگئے کس سے گناہ گار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی!

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق! تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند!

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی
ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک!

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو
کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے، دل خرد سے

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے　　خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن، بندگی استغفر اللہ　　یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار　　شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے　　کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے　　ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال　　مردِ بیکار زن تہی آغوش

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو　　مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است　　چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل که در آغوشِ ساحل　　تپیدیک دم و مرگِ دوام است

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش　　ہر چند کہ دانا اُسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں　　بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مجو از من کلامِ عارفانہ　　کہ من دارم سرشتِ عاشقانہ
سرشکِ لالہ گوں را اندریں باغ　　بیفشانم چو شبنم دانہ دانہ

LIBRARY
IQBAL ... KARACHI
Book No 191

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY
ACC NO
LAHORE

"جوہر" ادب اُردو نمبر

ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کی سترویں سالگرہ کے موقع پر مکتبہ جامعہ نے طلبائے جامعہ کی انجمن اتحاد کے آرگن رسالہ جوہر کا ادب اردو نمبر شائع کیا ہے، جس میں اردو ادب و زبان پر ملک کے سربرآوردہ اصحاب قلم مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر آل احمد سرور، جناب سی احمد اکبر آبادی، پروفیسر حامد اللہ افسر، پروفیسر سراج احمد فانی، پروفیسر احتشام حسین رضوی مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ کے تنقیدی، ادبی اور تاریخی مضامین کے علاوہ مولانا عبدالحق صاحب کے حالات اور خدمات پر ایسے لوگوں کے مضامین ہیں جو مولانا کی خلوت و جلوت کے شناسا اور واقف کار ہیں

اس کے علاوہ ملک کے سربرآوردہ رہنماؤں اور قائدین ملت کے پیغامات بھی شریک اشاعت ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی سر اکبر حیدری وزیر اعظم دولت آصفیہ، سر عبدالقادر، ڈاکٹر سر شاہ سلیمان، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر سید محمود، بلبل ہند سروجنی نائیڈو، جناب آصف علی وغیرہ۔ قیمت عہ

"مکتبہ جامعہ دہلی"

00000191